TWO QUESTIONS.

دو سوال

۱- کیا میں خدا کی ہستی پر ایمان لا سکتا ہوں؟

۲- اگر لا سکتا ہوں تو اُس کا عرفان کیونکر حاصل کر سکتا ہوں؟

من تصنیف

ایک پرسبٹر

مترجمہ

پروفیسر محمد اسمعیل خان صاحب



CHRISTIAN LITERATURE SOCIETY FOR INDIA

PUNJAB BRANCH, LUDHIANA

جسکو

کرسچن لٹریچر سوسائٹی فار انڈیا نے

شائع کیا

دفعہ اول   تعداد جلد ۱۰۰۰   سنہ ۱۹۱۰ء   قیمت ۳ر

Price 3 as.

دو سوال

۱۔ کیا میں خدا کی ہستی پر ایمان لا سکتا ہوں؟
۲۔ اگر لا سکتا ہوں تو اُسکا عرفان کیونکر حاصل کر سکتا ہوں؟

من تصنیف

ایک پریسبٹر

مترجمہ

پروفیسر محمد اسمٰعیل باہتمام ڈاکٹر ای۔ ایم ویری صاحب

جو

کرسچن لٹریچر سوسائیٹی کی پنجاب برانچ کیطرفسے

شائع کیئے گئے

سنہ ۱۹۰۹ء

طبع اوّل

تعداد جلد ۱۰۰۰



دو سوال

پہلا

مَیں خُدا پر ایمان رکھتا ہوں

تمہید مجھے یاد ہی کہ ایک دفعہ دینی گفتگو کرنیکے لئے مجھے دو دوستوں سے تنہائی میں ملاقات کرنیکا اتفاق ہوا۔ اُن میں سے ایک مسلمان تھا اور دوسرا ہندو۔ پہلے ہندو نے پھر خاموشی کو توڑا اور کہا کہ "سب سے پہلے ہمیں یہہ دریافت کرنا چاہئیے کہ خدا ہی یا نہیں"۔ اِس پر مسلمان نے کہا "نہیں صاحب۔ اِس قدر تو ہم سب جانتے ہیں۔ اگرچہ بعض لوگ بظاہر خدا کی ہستی کے منکر ہیں تو بھی ہر ایک اِنسان اپنے دِل میں ضرور مانتا ہی کہ خدا ہی۔ جو بات ہمیں دریافت کرنا ہی وہ یہہ ہی کہ جس خدا کی ہستی کے ہم دل میں قائل ہیں اُسے کیونکر جانیں"؟

بہت سے لوگ مسلمان سے اتفاق کرینگے۔ چنانچہ وہ ہندو فوراً اپنے دوست کی اصلاح قبول کر کے اُس سے متفق ہو گیا کیونکہ اُس نے جو مضمون بحث کے لئے پیش کیا تھا اُس پر ایک لفظ بھی اور نہ کہا یہاں ہیں تو نہیں مانتا کہ مسلمان نے

ع۔ شروع میں لفظ خدا بغیر خاص معنوں کے استعمال کیا گیا ہی۔ ہم اِسے نامعلوم مقدار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اگر تحقیقات کے بعد معلوم ہوا کہ یہہ نامعلوم مقدار ہمسے یا ہمارے حالات سے کچھ واسطہ نہیں رکھتی اور معدوم ہی تو ہم اِسے اپنے خیال سے گرا دینگے لیکن اگر بخلاف اِسکے یہہ ثابت ہوا کہ فی الحقیقت کسی ایسی مقدار کا وجود ہی یا ہو سکتا ہی تو اِسے ٹھیک طور سے معلوم کرنے اور اِس کی اصلی قدر و قیمت پہچاننے کی کوشش کرینگے +

بالکل ٹھیک کہا۔ ہم دو قسم کے لوگ دیکھتے ہیں اور یہہ دو قسم کے لوگ خدا کی ہستی کے مسئلہ پر دو طرح سے نظر کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ بیشک اس مسلمان کی مانند ہیں جو خدا کی ہستی کے مسئلہ پر کبھی نہیں سوچتے اور اُس کی تحقیق امکان سے خارج سمجھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہی کہ ”اُس لامحدود و ازلی قدرت منبع موجودات“ کے بارے میں غور و فکر کرنا اُن کے نزدیک انسان کی بساط سے باہر ہی لیکن یہہ لوگ اپنے ایمان کی صداقت پر ایک بھی دلیل نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک خدا کا وجود ایسا ہی یقینی ہی جیسا کہ سپہر گردان پر آفتاب موجود ہی۔ اس قسم کے لوگوں کیلئے صرف یہہ سوال باقی رہجاتا ہی کہ ”ہم خدا کا عرفان کیونکر حاصل کر سکتے ہیں“؟ لیکن اور قسم کے لوگ بھی ہیں جو باوجود دل میں قائل ہونے کے بھی اِسکا اقرار کرنے سے انکاری ہیں۔ در پردہ اور خفیہ طور سے بھی اقرار نہیں کرتے کیونکہ ایسا ایمان رکھنے کے لئے اُن کی عقلی اور ذہنی طور پر اپنی بھی تسکین نہیں ہوئی۔ ایسے لوگ تو صرف اُسی وقت کسی عقیدہ کے معتقد ہوتے ہیں جب وہ اپنے عقیدہ پر عقلی دلائل بھی رکھتے ہوں +

جیسے میرے مذکورہ بالا مسلمان اور ہندو دوستوں کے خیالات میں اختلاف پایا گیا ہی ویسے ہی ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگوں میں دو قسم کے مختلف خیالات رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ یہہ ضروری نہیں کہ وہ مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے لوگ ہوں تو خیالات میں اختلاف ہوگا مسلمان تو بیشک اسلامی تعلیم کے سبب سے بے دلیل ہی خدا کی ہستی کا قائل اور معتقد ہوگا کیونکہ وہ ہندو کی طرح خدا کی ہستی کے

بارہ میں آزادی سے سوچ نہیں سکتا۔ میرے ایک انگریز دوست کا خیال ہی کہ خدا کی ہستی کی کوئی کافی شہادت یا دلیل نہیں چنانچہ وہ اپنے خیال کے مطابق خدا کی ہستی کا منکر ہی۔ ایک اور شخص لکھتا ہی ”اس تمام جہان کے انتظام اور نظم و نسق میں کوئی فوق القدرت اعلےٰ دانائی مصروف ہی اور اب اِس سے اِنکار کی بہت ہی کم گنجائیش ہی“ +

انکارِ خدا

پھر بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو نہ صرف یہہ نہیں سوچتے کہ عقلی دلائل سے خدا کی ہستی کا ثبوت ملسکتا ہی بلکہ اس سے بڑھکر وہ کہتے ہیں کہ تمام عقلی دلائل اور شواہد سے ایسی ہستی کی نفی ثابت ہوتی ہی۔ ایسے لوگ نہایت آزادی اور صفائی سے اپنے آپ کو منکرانِ خدا کہتے ہیں اور اِس نام کو اختیار کر کے وہ اپنا عقیدہ یہہ بیان کرتے ہیں کہ خدا نہیں ہی۔ اُن کے فائدہ کے لیئے اِس مقام پر مسٹر جان فاسٹر کا ایک مشہور خط درج کیا جاتا ہی۔ یہہ خط اُن کی تصانیف کی طبع دہم کے ۸۹ ویں صفحہ پر پایا جاتا ہی۔ مسٹر فاسٹر منکرانِ خدا یعنے دہریوں کا بیان کرتے وقت اپنے تئیں۔ سوائے اُن لوگوں کے جو انہیں کی مانند خدا کی ہستی کے منکر ہیں۔ سب پر ترجیح دیتے ہیں اور اُن کی سبقت کی وجہ یہہ ہی کہ انکا خیال اوروں کے خیالات سے مختلف ہی چنانچہ وہ لکھتے ہیں ”اگر کسی کو یہہ معلوم ہو کہ خدا نہیں ہی تو ایسا عقیدہ رکھنا کچھ بہادری نہیں۔ کیونکہ ایسے عقیدہ سے اُس اعلےٰ و لامحدود دانائی پر دلالت ہوگی جس کے وسیلہ سے یہہ معلوم ہوا کہ خدا نہیں ہی۔ ایسی دانائی خدا کا انکار کرنے میں اپنے لیئے الوہیت کا دعویٰ کرتی ہی۔ کیونکہ جب تک خدا کا منکر آدمی ہر جگہ حاضر و ناظر نہو اور ایک ہی وقت میں تمام کائنات میں موجود نہو اُسے کیونکر معلوم ہو سکتا ہی کہ کسی نادیدہ مقام میں خدا نہیں ہی

جو اُسے مغلوب کر سکتا ہی۔ اگر وہ تمام کائنات میں ہر ایک فاعل سے آگاہ نہیں تو ممکن ہی کہ جسکو وہ نہیں جانتا وہی خدا ہو۔ اگر وہ خود دنیا کا فاعلِ مطلق نہیں اور یہہ بھی نہیں جانتا کہ فاعلِ مطلق کون ہی تو ممکن ہی کہ وہی نامعلوم فاعلِ مطلق خدا ہو۔ اگر وہ اُن تمام مقدمات پر قابض نہیں جن سے عالمگیر سچائی منتج ہوتی ہی تو ممکن ہی کہ جس مقدم کو وہ نہیں جانتا وہی یہہ ہو کہ خدا ہی۔ اگر وہ افرادِ کائنات کی ہستی کے اسباب پر حاوی نہیں تو ممکن ہی کہ جس سبب کو وہ نہیں جانتا وہی خدا ہو۔ اگر وہ غیر متعین زمانہ ماضی بعید کے ہر ایک فعل سے آگاہ نہیں تو ممکن ہی کہ اُن میں سے بعض افعال کا فاعل خدا ہو۔ پس اگر وہ خود ہمہ دان نہیں اور تمام رفتہ و گذشتہ کو نہیں جانتا یعنے خود خدا بنکر خدا کے وجود کا انکار نہیں کرتا تو وہ کیونکر جان سکتا ہی کہ جس ہستی کو وہ رد کرتا ہی فی الواقع اُسکا وجود نہیں ہی؟ اُسے اُس کی ہستی کی نفی کو یقینی طور پر جاننا ضرور ہی ورنہ جس بے باکی سے وہ منکر ہو کر منکرانہ زندگی بسر کرتا ہی از حد قابلِ نفرت اور رحم کے لائق ہی"۔

گذشتہ صدی کے اِس جدت پسند آزاد خیال کے الفاظ پر کسی طرح کے حاشیہ کی ضرورت نہیں۔ اُس کے استدلال کا خلاصہ یہہ ہی کہ کوئی شخص صاف طور سے خدا کی ہستی کا انکار نہیں کر سکتا جب تک کہ خود کنایتہً الوہیت کا مدعی نہو کیونکہ وہ ہمہ دانی کا دعویٰ کرتا ہی۔ نہ صرف حال کی باتیں بلکہ تمام گذشتہ کو اپنے علم میں رکھنے کا مدعی ہی اور ساتھ ہی یہہ بھی کہ وہ ہر وقت ہمہ جا حاضر و ناظر ہی۔

بیگانگی از خدا

لیکن خدا کی ہستی کا فی الحقیقت انکار کرنے والے بہت ہی کم ہیں۔

صاف اور خالص دہریہ کا وجود بہت ہی شاذ و نادر نظر آتا ہی بہت سے لوگ اپنے تئیں خدا سے بیگانہ یعنی لاعلم کہتے ہیں۔ اِس نام کی تعریف کرنا ضروری معلوم ہوتا ہی کیونکہ یہہ دو مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہی۔ بعض تو صرف اِن معنوں میں استعمال کرتے ہیں کہ اُن کے خیال میں خدا کی ہستی ثابت نہیں کی گئی یا کم از کم یہہ کہ اُن کو کوئی خاطر خواہ ثبوت نہیں ملا اور نتیجتہً وہ اپنے تئیں خدا سے لاعلم کہتے ہیں اور خدا کی ہستی کو اپنے علم سے بالکل خارج کرتے ہیں۔ اِس نام کے ایسے استعمال پر کسی کو کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا۔

مگر اِس کے ایک معنے اور بھی ہیں جن پر اعتراض کرنا بالکل ٹھیک ہی۔ بعض اِس نام کے استعمال سے نہ صرف اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہیں بلکہ اُن کا دعویٰ یہہ ہی کہ کوئی اور بھی خدا کو نہیں جانتا اور اُس کی بابت کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکتا۔ نابینا یہہ تو کہہ سکتا ہی کہ وہ سورج کی روشنی کے بارہ میں کچھ نہیں جانتا اور روشنی کے وجود پر جو شہادت بہم پہنچائی جاتی ہی وہ اُس کے نزدیک کافی اور تسلی بخش نہیں ہی لیکن وہ ہرگز ہرگز یہہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ اُس نے اور اُس کے نابینا دوستوں نے کبھی روشنی نہیں دیکھی اِس لئے کسی اور شخص نے بھی کبھی نہیں دیکھی۔ اِس قسم کے لوگ بالکل مذکورہ بالا منکرانِ خدا دہریہ لوگوں کی مانند ہیں۔ اگر کوئی شخص خدا کی بابت کچھ نہیں جانتا تو بیشک وہ اپنی لاعلمی کا اظہار و اقرار کر سکتا ہی۔ ایسا کرنا عرفان کے جھوٹے دعوے سے بہت بہتر ہی لیکن کوئی شخص اپنی لاعلمی سے یہہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتا کہ سب لوگ اُس کی مانند لاعلم ہیں۔

اِس رسالہ کی غرض خدا کی ہستی کو ثابت کرنا نہیں ہے۔ دلائل و شواہد پیش کرنا اور کہنا کہ ہم نے خدا کی ذات کا ایسا ثبوت دیدیا ہے کہ اب اُس پر اعتراض کی گنجائش نہیں گویا ایسا کام کرنے کا دعویٰ کرنا ہے جو خود خدا نے (یہہ فرض کرکے کہ خدا ہے بھی نہیں کہا۔ صرف یہہ حقیقت کہ بعض دیانتدار اور منصف مزاج آدمی خدا کی ہستی کے کافی اور معقول دلائل نہیں پاتے اِس بات کا ثبوت ہے کہ خود خدا نے بھی اِس حقیقت کا کافی اور مدلل ثبوت نہیں دیا کہ وہ ہے۔ جو کام اُس نے نہیں کیا ہم اُس پر ایمان رکھنے والے اُس کے کرنے کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔ ہم صرف اِسی بات پر قناعت کرتے ہیں کہ جو دلائل اور خیالات ہم کو درست معلوم ہوتے ہیں اُن کو ظاہر کردیں۔ ممکن ہے کہ وہ اوروں کے لئے بھی مفید ہوں۔ ہم نے کہا ہے کہ بعض دیانتدار اور منصف مزاج آدمی خدا کی ہستی کے قائل نہیں ہیں لیکن اِس سے یہہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ ہر ایک ایسا شخص جو خدا کی ہستی کا قائل نہیں دیانتدار یا منصف مزاج کہلا سکتا ہے۔ کیونکہ بعض ایسے بھی ہیں جو دلائل سے نہیں بلکہ اپنی خواہش سے خدا کا انکار کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ خدا کی ہستی کا اقرار اُس کی مرضی کی اطاعت و بجاآوری کو واجب ٹھہراتا ہے۔ وہ ایسی فرمانبرداری کے لئے رضامند نہیں ہیں لہذا خدا کی ہستی کا انکار کرکے اِس اطاعت کی ذمہ واری سے بچنا چاہتے ہیں۔ اُنھوں نے معقول دلائل کی بنیاد پر خدا کا انکار نہیں کیا اور نہ اُن کی بے ایمانی اُن کے دل کے اصلی خیالات سے مطابقت رکھتی ہے +

ایک بیّن حقیقت یعنے مَیں ہوں

جبکہ ہم اِس تحقیقات میں مصروف ہیں کہ

آیا خدا ہے یا نہیں تو ضرور ہے کہ کسی متعارفہ حقیقت سے شروع کریں۔ اگر ہم کوئی ایسی چیز پا دیں جسکا ہم کو علم ہو تو اُس سے نامعلوم کی جستجو کریں۔ مجھے کسی چیز کی نسبت کیا علم ہے؟ کہاں سے شروع کروں؟ میرا خیال ہے کہ میں سائنس کی حقیقتوں اور تواریخ وغیرہ کے متعلق بہت سی باتوں کی نسبت کچھ جانتا ہوں لیکن بعض آدمی بتلاتے ہیں کہ ہمارے تمام علوم دھوکہ ہیں۔ ہمارا ایک بڑا بھاری سائنس دان کہتا ہے کہ جسقدر آدمی علوم میں ترقی کرتا ہے اُسی قدر زیادہ وہ اپنی لاعلمی اور جہالت کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ جسقدر ہم علم کے پہاڑ کی بلندی پر چڑھتے جاتے ہیں اُسی قدر زیادہ صفائی سے نہایت وسیع اور نئے میدان اور چوٹیاں دیکھتے ہیں جن پر پہنچنا ہنوز باقی ہے۔ فی الحال جو کچھ سائنس سکھا رہی ہے اُس سے ہم کو کوئی ایسی پختہ اور بنیادی بات نہیں ملتی جس پر ہم عمارت قائم کریں۔ سائنس کے بارہ میں ایک پشت کے خیالات اور معتقدات کو دوسری پشت رد کردیتی ہے۔ اگر تواریخ کو دیکھیں تو مشکل ہے کوئی ایسا واقعہ ملیگا جس کی صحت و درستی پر نکتہ چینوں نے اعتراضات نہ کئے ہوں۔ اور اگر کسی بات پر متفق ہوکر لوگوں نے اُسے ایک حقیقت تسلیم بھی کیا ہے تو ہر ایک شخص اُس کا جداگانہ مطلب بیان کرتا ہے +

ہندو فیلسوف یہہ تعلیم دیتے ہیں کہ ہمارے اردگرد کوئی چیز حقیقی نہیں ہے۔ جو چیزیں ہم محسوس کرتے اور دیکھتے ہیں فی الحقیقت وہ کچھ نہیں ہیں۔ تمام اشیا جن کو ہم موجود خیال کرتے ہیں اُنکا وجود صرف ہمارے تصور میں ہے۔ ہم اپنی تحقیقات اِسی سے شروع کرینگے۔ فرض کیا کہ ہمارے اردگرد کی تمام اشیا محض ہمارے تصور کا نتیجہ ہیں

لیکن پھر بھی ایک چیز باقی رہجاتی ہی اور وہ خود ہمارا تصور ہی جس پر ہماری غلطی یا خطا کی جوابدہی کا بوجھ قائم ہوتا ہی+

پس تمام حقیقتوں میں سے یہہ سب سے بڑی حقیقت قائم رہتی ہی کہ میں ہوں۔ کسی طرح کے دلائل و براہین اس حقیقت کو ہلا نہیں سکتے۔ اگر کوئی اس حقیقت کو ہلانے کی کوشش کرے تو وہ فوراً اپنے دلائل کو دیوانگی سے منسوب کریگا کیونکہ وہ میری ہستی کی نفی ثابت کرنے کے لئے اپنی نسبت کہیگا کہ میں ہوں۔ میں یہہ تو نہیں کہتا کہ میں کسی دوسرے پر اپنی ہستی ثابت کر سکتا ہوں۔ یہہ ہو سکتا ہی کہ دوسرے مجھ کو اپنے دماغ کا محض ایک تصور خیال کریں لیکن میں یہہ کہونگا کہ کسی طرح کے دلائل اور فیلسوفانہ سوچنے کا کوئی طریق میرے اس علم کو کہ میں ہوں ذرا بھی مشکوک نہیں کر سکتے۔ فی الحال یہہ تو ہو سکتا ہی کہ میں کسی اور چیز پر ایمان نہ رکھوں لیکن اس بڑی حقیقت پر سے میرا ایمان متزلزل نہیں ہو سکتا۔" وہ بعید الفہم امور جن پر جسقدر زیادہ سوچا جائے اُسی قدر زیادہ بعید الفہم ہوتے جاتے ہیں اُن میں سے سوچنے والے کے لئے یہہ ایک یقینی بات ہی کہ وہ خود خواہ کچھ ہی ہو۔ ہے" میں نے پڑھا ہی کہ پروفیسر کلفرڈ ایک بڑے مشہور دہریہ لاعلم از خدا کی قبر پر اُس کے اپنے یہہ الفاظ کندہ ہیں کہ "میں نیست تھا میری ماں نے مجھے پیٹ میں لیا۔ میں نے زندگی بسر کی اور کچھ تھوڑا سا کام کیا میں نیست ہوں اور مجھے اس کا غم نہیں"۔ آخری دونوں فقروں پر نظر کرنے سے ایک عجیب قسم کا تناقض دکھائی دیتا ہی۔ اُن میں سے پہلے فقرہ میں وہ اپنی نیستی کا اظہار کرتا ہی اور دوسرے میں اپنے

لئے غم سے آزادی کا مدعی ہی جس سے صاف ایک ایسی ہستی ثابت ہوتی ہی جسکو غم لاحق ہو سکتا ہی۔ یہہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ پروفیسر کلفرڈ نے اور کسی بات کو مانا ہو یا نہ مانا ہو لیکن وہ اپنی انفرادی ہستی کو تو ضرور مانتا تھا چنانچہ اُسکے کتبۂ قبر کے ہر حصہ سے یہہ بات نہایت صفائی اور صراحت کے ساتھ نظر آتی ہی+

پس اب ہم میں ہوں سے اپنی تحقیقات شروع کرینگے میں کیا ہوں؟ (الف) جسم۔ جب میں اپنی ترکیب پر نگاہ کرتا ہوں تو کیا نظر آتا ہی؟

میری نسبت سب سے پہلی اور بیّن تر یہہ بات ہی کہ میں فی الحقیقت جسم رکھتا ہوں یا کم از کم جسم رکھتا ہوا معلوم ہوتا ہوں طبعی تفصیل کو (جس میں غلط اور صحیح ہونیکا امکان ہی) چھوڑ کر ایسا معلوم ہوتا ہی کہ یہہ جسم اُن اشیا سے کچھ واسطہ رکھتا ہی جنکو میں دیکھتا یا سوچتا ہوں۔ میں اردگرد مادی دنیا کا ایک حصہ دیکھتا ہوں جس کی نسبت سائنس دان بیان کرتے ہیں کہ یہہ مختلف مادی اشیا اور خصوصاً پانی میں تبدیل ہو سکتا ہی۔ اب میں اس کی نسبت صرف اس بات کا خیال کرونگا کہ یہہ اپنی پرورش کے لئے محتاج بالغیر ہی اور یہہ ضروری بات ہی کہ وہ خوراک اس جسم کے خواص رکھتی ہو تاکہ اس سے ملجاوے۔ اگر اس قسم کی خوراک متواتر بہم نہ پہنچے تو یہہ جسم کمزور ہو کر برباد ہو جائیگا+

(ب) عقل۔ پھر میں دیکھتا ہوں کہ عقل یا فہم و ادراک کی قوت اس جسم میں مقیم ہی۔ اس قوت کی صاف تعریف کرنا تو بیشک مشکل ہی لیکن اس بات کا مجھے کامل یقین ہی کہ یہہ مجھ میں ہی۔ کوئی شخص اس کی عدم موجودگی کو ثابت نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کی نیستی کے دلائل پرکھنے کے لئے اسی کے سامنے پیش نہ کرے۔ یہہ استدلال کی قوت

بھی جسم کی طرح خوراک کی محتاج ہی اور اس کی خوراک بھی خارجی اشیا ہیں ہی۔ اگر سوچنے کے لئے بیرونی اشیا یا دیگر لوگوں کے خیالات نہوں تو میری عقلی قوت جاتی رہیگی یہہ عقلی بربادی اُسوقت وقوع میں آویگی جب باوجود چاروں طرف خوراک کی افراط کے مَیں اُس کی پرورش نہ کروں کیونکہ جسم کے لئے بھی خوراک کی صرف ہستی ہی کافی نہیں ہی بلکہ ضرور ہی کہ خوراک کھائی جائے اور ہضم ہوکر جسم سے مل جاوے +

اب اپنے بارہ میں اور زیادہ سوچنے سے پیشتر مَیں اپنے احباب سے پوچھتا ہوں کہ آپکا ذاتی تجربہ یہانتک میرے تجربہ سے موافقت و مطابقت رکھتا ہی کہ نہیں ؟ مَیں دیکھتا ہوں کہ یہاں تک سب میرے ساتھ متفق ہیں +

سب میری طرح جسم رکھتے ہیں اور سبھوں میں کم و بیش عقل بھی ہی لیکن جس طرح ہماری جسمانی قوتیں مختلف و متفاوت ہیں اُسی طرح عقلی قوتیں بھی برابر نہیں ہیں +

اب ایک مشکل سوال پیش آتا ہی کہ آیا جسم اُس عقل یا قوتِ استدلال سے جو اُس میں رہتی ہی جدا ہو سکتا ہی یا اُن میں جدائی ناممکن ہی؟ کیا وہ دو مختلف چیزیں ہیں یا ایک ہی ہیں؟ غالباً پہلے تو ہم یہی کہنا چاہینگے کہ ایک ہی ہیں کیونکہ اکٹھے ہی وجود میں آتے ہیں۔ بچہ شروع ہی سے اپنے کمزور بدن میں قوت استدلال و خیال کے آغاز کے نشان دکھلاتا ہی اور جب جسم فنا ہوتا ہی تو بظاہر عقل بھی اُس کے ساتھ ہی فنا ہو جاتی ہی۔ فی الواقع عقل کی لازوال ہستی کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہہ بھی چند دلائل سے دکھلا سکتے ہیں کہ اگرچہ عقل ایسے طور سے جسم سے وابستہ ہی تو بھی دونوں ایک ہی نہیں بلکہ جدا جدا دو چیزیں ہیں۔

(۱) اگر جیسا کہ بہت سے لوگ فرض کئے بیٹھے ہیں جسم اور عقل کی ذات و ہستی ایک ہی ہوتی تو ہم کو یہہ عام قانون نظر آتا کہ بنی آدم کی عقلی قوت جسمانی قوت کی مناسبت سے ہوتی اور اگر مساوی جسمانی قوت کے دو آدمیوں کو تحصیل علوم اور ذہنی ترقی کی کا مساوی موقعہ دیا جاتا تو اُن کی ترقی میں بھی مساوات پائی جاتی لیکن تجربہ پکار کر کہتا ہی کہ ایسا ہرگز نہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض تندرست اور توانا آدمی تحصیل علوم اور ذہنی ترقی کا موقعہ حاصل کرکے اُسے ٹھیک طور سے کام میں لاتے ہیں پر تو بھی عقلی قوت کے کسی کام میں وہ کوئی نمایاں ترقی نہیں دکھاتے حالانکہ بخلاف اس کے بعض جسمانی طور پر بہت کمزور لوگ عقلی قوت میں بہت برتری حاصل کرتے ہیں۔ (۲) اگر جسمانی طاقت اور عقلی قوت کا ایسا رشتہ ہوتا کہ اُن کو ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکتے تو کسی جسمانی عضو کے نقصان یا جاتے رہنے سے عقل کا نقصان یا جاتی رہنا لازم ٹھہرتا لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ آدمی کا ہاتھ یا پاؤں کٹ جانے سے اُس کی عقلی قوت میں فرق نہیں آتا ممکن ہی کہ آدمی مسٹر کنواہ ایم۔ پی کی طرح بے ہاتھ پاؤں پیدا ہوا اور پھر بھی اُس کی عقلی اور ذہنی طاقتیں اعلےٰ درجہ کی ہوں +

شاید کوئی اِسکا جواب یوں دیوے کہ عقلی قوٰے کی جائے رہایش جسم کا ایک خاص حصہ یعنے دماغ ہی۔ وہیں سے یہہ قوٰے بیرونی حالات کو معلوم کرتے اور جسم کے اعضا پر حکمرانی کرتے ہیں۔ جب تک دماغ سلامت ہی تب تک کسی دوسرے عضو کا نقصان عقل کو نقصان نہیں پہنچاتا لیکن اِس موقعہ پر ایک اور بات قابلِ غور ہی۔ سائنس دان ہم کو تبلاتے ہیں کہ جسم ہمیشہ تبدیل ہوتا رہتا ہی اور چند سال کے عرصہ

میں بالکل نیا ہو جاتا ہی۔ پہلے جسم کا ایک ذرہ بھی باقی نہیں رہتا۔ اِن تمام تغیرات میں عقل ویسی ہی رہتی ہی اور اپنے ذخیرہ معلومات میں متواتر کچھ نہ کچھ زائد کرتی رہتی ہی۔ ہم بھول جانے اور فراموش کرنے کا ذکر کرتے ہیں لیکن فی الحقیقت کوئی بات فراموش نہیں ہوتی۔ صرف بعض باتیں غلط جگہ پر رکھی جاتی ہیں اور ضرورت کے وقت عقل کا ہاتھ اُن تک نہیں پہنچتا لیکن جو بات ایک بار ذہن نشین ہو جاتی ہی وہ کبھی قطعاً فراموش نہیں ہوتی +

یہہ بات تو بالکل صاف ہی کہ ہر شخص کی عقل کا اُس کے جسم سے بہت ہی قریبی رشتہ ہی کیونکہ یہہ دونوں باہم وجود میں آتے اور نشو و نما پاتے ہیں اور فنا و نابود بھی اکٹھے ہی ہوتے ہیں۔ لیکن دونوں کے متعلق چند ایسی حقیقتیں ہیں کہ اگر اِن دونوں کو فی الواقع ایک ہی فرض کر لیا جاوے تو اُن حقیقتوں کو سمجھنا محال ہی۔ اگر کوئی اِس امر کی مزید تحقیقات کرنا چاہے تو میں اُسے صلاح دونگا کہ ڈارون کی تعلیم کے بارہ میں پروفیسر والیس کی کتاب پڑھے۔ اُس کی ایک اور کتاب اِس سے بیشتر جزیرہ نما ملیے کی نسبت بھی اُنہیں ایام میں چھپی تھی جبکہ ڈارون کی "ڈی سینٹ آف مین" طبع ہوئی تھی اور خیال کیا جاتا تھا کہ ادنے درجہ سے ترقی کا خیال جو ڈارون نے اِنسانی زندگی کے بارہ میں قائم کیا تھا اُسکا ثبوت اِس کتاب میں بہت صحت و درستی کے ساتھ درج تھا۔ اپنی بعد کی تصنیف میں بھی وہ ڈارون کے خیال کو انسانی جسم کی تواریخ کے باب میں حق تسلیم کرتا ہی لیکن اُس کتاب کے آخری باب میں جسکا مضمون اِنسان ہی وہ اِس امر کے دلائل پیش کرتا ہی کہ ڈارونینی تعلیم کا قانون "قدرتی انتخاب

اور قابل ترین کی بقا" انسان کی عقلی قوتوں کا کچھ بھی بیان نہیں کرتا اور کوئی سبب نہیں بتاتا۔ اُس نے نتیجتہً لکھا ہی کہ "ہم نے دو طرح کے جدا جدا دلائل سے دکھلایا ہی کہ مہذب انسان میں اُس کی قوتیں کامل ہوتی ہیں جو کہ اپنی اصلی صورت، منصب اور مختلف موقعوں کے لحاظ سے اُن خواص سے بالکل نرالی ہیں جو انسان کی ذات کو لازم ہیں اور اُس کی زندگی کی ضروریات کے وسیلہ سے موجودہ کمال کو پہنچے ہیں"۔۔۔ (اِس موقعہ پر پروفیسر صاحب موصوف ان خاص قوتوں کے چند خواص و نتایج کا ذکر کر کے فرماتے ہیں) "اِن خواص میں سے ایک بھی مذکورہ قوتوں کے پیدا کرنے میں "قدرتی انتخاب" کے قانون سے مطابقت نہیں رکھتا ہی اور اگر حقیقتوں پر مجموعی طور سے نظر کی جاوے تو وہ ہمکو مجبور کرتی ہیں کہ ہم انسان کے حیوانی خواص کے سوا اُن قوتوں کے لئے کوئی اور اصل یا مخرج تسلیم کریں۔ انسان کی خاص قوتیں اور قابلیتیں جن پر ہم بحث کر چکے ہیں اُن سے صاف معلوم ہوتا ہی کہ انسان میں ضرور کوئی ایسی چیز موجود ہی جو اُس نے اپنے آبا و اجداد سے ورثہ میں حاصل نہیں کی ہی ...... پس ہم دیکھتے ہیں کہ جب ڈارونینی خیال سے آخری منطقی نتیجہ بھی اخذ کیا جاتا ہے تو نہ صرف مخالفت نہیں کرتا بلکہ انسان کی روحانی طبیعت کی ہستی کی نہایت زور سے تائید کرتا ہی۔ اِس سے ہم یہہ سیکھتے ہیں کہ انسانی جسم نے کس طرح "قدرتی انتخاب" کے قانون کے موافق ادنے حیوانی جسم سے بتدریج ترقی کی ہوگی لیکن ساتھ ہی یہہ پتہ بھی ملتا ہی کہ ہم عقلی اور اخلاقی قوتیں بھی رکھتے ہیں جو جسم کی طرح کسی تدریجی ترقی کا نتیجہ نہیں ہو سکتیں بلکہ انکی اصل کچھ اور ہی ہی اور اس اصل کا سوائے نادیدنی عالم ارواح کے اور کہیں پتہ نہیں ملتا" +

ایک سائنس دان کا خیال ہی کہ اِنسان ایک ایسی ذہنی اور عقلی طبیعت بھی رکھتا ہی جو نہایت عجیب طور سے اُس کی جسمانی طبیعت سے مخلوط ہی لیکن اپنی اصل کے لحاظ سے جسم سے بالکل جدا ہی۔ انسانی ہستی کا یہہ عقلی حصّہ بھی جسمانی حصّہ کی طرح خارجی سامانِ پرورش کا محتاج ہی۔ ڈارونی خیال بے ٹھکانا قیاسی باتیں تجویز کر سکتا ہی لیکن انسانی جسم کی اصل کو ثابت نہیں کر سکتا کہ کیا ہی۔ اور پروفیسر والیس کے خیال کے مطابق اِنسانی عقل کا تو کچھ بھی بیان نہیں کرتا۔ جسم اور عقل دو مختلف اشیا ہیں میرے خیال میں جسم اور عقل دونوں ملکر اُس جہاز کی مانند ہیں جو ہوشیار ملاحوں کی جماعت کے ساتھ سطح سمندر پر سفر کر رہا ہو۔ بظاہر جہاز اور اہلِ جہاز کی ہستی ایک ہی شی معلوم ہوتی ہی جہاز کا وجود اپنے مستولوں اور دیگر ساز و سامان سمیت اِنسان کے جسم کی مانند ہی اور ملاحوں کی جماعت بمنزلہ عقل انسانی ہی۔ ملاحوں کے بغیر ایسے جہاز کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ ہوا اور موجیں جدھر چاہتی ہیں اُسے لیجاتی ہیں۔ اسی طرح انسانی جسم بھی عقل کے بغیر خواہشات اور خواہشات کے خارجی اسباب کے بس میں ہی۔ جسطرح ملاح ہوا اور موجوں کو اپنی مرضی کے موافق استعمال کرتے ہیں اُسی طرح عقلمند آدمی اگرچہ جسمانی خواہشوں اور جذبوں سے خالی نہیں ہی تو بھی اُن پر حکمران ہو کر اُن کو اپنے فائدہ اور بہتری کے لئے استعمال کرتا ہی۔ وہ جسم کی خواہشوں کا غلام نبکر آوارہ نہیں ہوتا بلکہ اپنے جسم اور خواہشات کو اُس نشان کی طرف لیجاتا ہی جس کی طرف عقل ہدایت کرتی ہی۔ جب انسان پر نفسانیّت غالب ہوتی ہی تو وہ اُس شکستہ جہاز کی مانند ہوتا ہی جسے ہوا جدھر چاہے لئے پھرتی ہی۔ عموماً اِنسان کے جسم کی عقل ایسی ہدایت کرتی

ہی جیسی ہوشیار ملاح جہاز کی کرتے ہیں۔ بعض آدمیوں کی عقلی قوتیں ایسی زبردست ہیں کہ وہ دخانی جہاز کی مانند بے روک سیدھے اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھے چلے جاتے ہیں راستہ میں کیسی ہی مشکلات پیش آویں اُن کو مطلق پروا نہیں۔ ہر ایک ایسے جہاز میں ایک ناخدا ہوتا ہی جو ملاحوں کو حکم دیتا ہی اور اس ناخدا کے حکم جہاز کے مالک کی مرضی کے موافق ہوتے ہیں اگرچہ مالک خود جہاز پر موجود نہیں ہوتا۔ اب ہم اِس ناخدا کی نسبت کچھ سوچینگے ✣

(ج) مَیں۔ اب مَیں پھر اپنا خیال کرتا ہوں۔ کیا جب مَیں نے یہہ کہا کہ مَیں جسم اور عقل کا مرکب ہوں تو میری ہستی کا پورا بیان ہو گیا؟ اگر یہی کہنا کافی ہی تو اِس مرکب کے تمام افعال یا تو جسم اور عقل دونوں کی متفق ہدایت کے موافق ہونگے یا دونوں کی باہمی مخالفت کی حالت میں یا مَیں جسم کا حکم بجا لاؤنگا یا عقل کا۔ ہم لوگوں کو اِن تینوں مختلف صورتوں میں کام کرتے دیکھتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی لوگ ایسے کام بھی کرتے ہیں جو جسم کی خواہش یا عقل کی تحریک یا اِن دونوں کے متفق تقاضے سے نہیں ہوتے۔ مثلاً میرا ایک دوست ہندوستان کے ایک عمدہ آب و ہوا کے مقام کو چھوڑ کر قحط زدہ لوگوں میں کام کرنے کے لئے ایسی جگہ گیا ہی جہاں حال ہی میں ہیضہ سے دو تین موتیں ہو چکی ہیں۔ میرا دوست کوئی سرکاری ملازم نہیں ہی لہذا ہم یہہ خیال نہیں کر سکتے کہ زیادہ تنخواہ یا ترقی کی خواہش نے اُسے وہاں جانے کی ترغیب دی ہی اُس کے اس فعل کو جسمانی یا عقلی تحریک یا جسم اور عقل دونوں کی خواہش سے منسوب کرنا ناممکن ہی۔ ایسے فعلوں کا سبب صرف یہی ہو سکتا ہی کہ انسان میں جسم اور عقل

کے علاوہ ایک اور تیسری قوت تسلیم کرلی جاوے جو ان دونوں سے نرالی اور دونوں پر حکمران ہی- اپنی ہستی پر غور کرنے سے مجھے کامل یقین ہوتا ہی کہ یہہ تیسری قوت ضرور مجھہ میں موجود ہی- اور اس سے بڑھکر یہہ بات ہی کہ اس تیسری قوت کو خواہ ہم کسی نام سے نامزد کریں حقیقی میَں اسی قوت سے مراد ہی- اس قوت کا دیگر قوا سے وہی رشتہ ہی جو کوئی صاحب خانہ گھر اور اُس کے متعلقہ تمام نوکر چاکروں سے رکھتا ہی یا جو رشتہ ناخدا کو جہاز اور اُس کے ملاحوں سے ہی- گھر کا مالک بعض اوقات اپنے نوکروں کی صلاح کے موافق بھی کام کرلیتا ہی اور اُس کے افعال کا مقصد عموماً تمام گھر اور نوکروں وغیرہ کی فلاح وبہتری ہوتا ہی لیکن ساتھہ ہی وہ یہہ بھی کرسکتا ہی کہ گھر اور نوکروں وغیرہ کی صلاح پر بالکل عمل نہ کرے اور ان کی فلاح کے خیال سے بالکل خالی ہو جو کچھہ میَں اپنے آپ میں پاتا ہوں اور لوگ بھی اپنے آپ میں اُسے محسوس کرتے ہیں اور اپنی نسبت دوسروں میں ہم اس کو زیادہ صفائی سے دیکھتے ہیں ہم دوسروں میں یقیناً اسی تیسری قوت کو حقیقی آدمی سمجھتے ہیں- فرض کرو کہ ہمارا کوئی دوست کامل طور سے تندرست وقوی اور ذہین ہی ہم اُسکی جسمانی اور عقلی قوت وخوبی کے لحاظ سے اُس میں کوئی عیب نہیں دیکھتے لیکن پھر بھی ہم کہتے ہیں "ہم اس آدمی کو پسند نہیں کرتے" یا ایک اور دوست کا خیال کریں جو عقلی اور جسمانی طور پر کمزور ہی لیکن تو بھی وہ ایسا راستباز ہی کہ سب لوگ اُسے دوست رکھتے اور اُس کی عزت کرتے ہیں +

پس خواہ ہم اپنے آپ پر نظر کریں یا دوسروں کو دیکھیں ہر ایک فرد بشر میں ایک تیسری ہستی یا حقیقی آدمی نظر آتا ہی- یہہ بتانا آسان نہیں کہ یہہ تیسری قوت کیا شی ہے اِس کو کسی ٹھیک نام سے نامزد بھی نہیں کرسکتے لیکن جب تک کوئی بہتر نام نہ مل سکے

تب تک ہم اِس کو انسانی رُوح کہینگے +

جس چیز کی نسبت میں کچھہ جانتا ہوں اُس کی تشریح اب میَں تمام کرچکا- میں اپنے تئیں ایک مادی جسم والا پاتا ہوں جس میں کسی قدر آمیختہ لیکن پھر بھی ایک جدا ہستی عقل موجود ہی- اور جسم وعقل دونوں ملکر رُوح کے تصرف میں ہیں +

میَں ہوں- تو ہی- وہ ہی جو کچھہ میَں جانتا ہوں اب اُسکا خیال چھوڑکر جو کچھہ میَں نہیں جانتا اُس کی طرف متوجہ ہونگا +

(۱) دُنیا- جب میَں اپنی چاروں طرف دیکھتا ہوں تو ہر جگہہ وہی مادی دنیا نظر آتی ہی جو اُنہی اجزا سے مرکب ہی جن سے میرے جسم نے ترکیب پائی ہی یا جنکا میرا جسم ایک حصہ ہی- جب میں سائنس دان اصحاب کی زیر ہدایت اِس دنیا کا مطالعہ کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہی کہ یہہ مادی دنیا خواہ اُسکا مطالعہ مجموعی صورت میں ہو خواہ ایک پھول یا خورد ترین کیڑے کو جداگانہ لیا جاوے نہایت عجیب حکمت سے پر ہی- اپنی وضع میں انسانی کاریگری کے اعلےٰ ترین نمونوں سے بہت ہی بڑھ چڑھکر ہی- یہہ کل کس طرح ایجاد ہوئی اور کمال کے موجودہ درجہ پر کس طرح پہنچی؟ یا تو یہہ صرف اتفاقیہ غبار کائنات سے جیسا کہ کہا جاتا ہی پیدا ہوگئی اور موجودہ صورت میں آگئی یا غبار کائنات کے سوا کسی طاقت نے اِسے موجودہ قوانین ترتیب اور خوبصورتی کے ساتھ ظاہر کردیا؛

اتفاقیہ اب ایسے اتفاقیہ اظہار کا امکان اس قسم کا نہیں جس پر غور وفکر کی ضرورت نہ ہو- ممکن ہی کہ چند اشیا اتفاقیہ ایسی ترتیب سے تقسیم کی جاویں کہ ہم کو اس خاص ترتیب کی وجہ سے اس اعتراض کی گنجایش نہو کہ چونکہ تقسیم میں یہہ ترتیب پائی جاتی ہی اسلیئے یہہ امر اتفاقی نہیں بلکہ کسی طاقت نے اپنی زیر نگرانی یہہ تقسیم

کرائی ہی بعض اوقات تاش کھیلنے والے لکھتے ہیں کہ تاش بانٹتے وقت چاروں کھیلنے والوں کے پاس چاروں رنگوں میں سے ایک ایک رنگ کے پورے پتّے آگئے۔ ایسے موقع پر خواہ مخواہ ہی یہہ خیال آتا ہی کہ یہہ امر اتفاقی نہیں ہوسکتا۔ اس میں ضرور پتّے بانٹنے والے نے کوئی چالاکی کی ہی لیکن پھر بھی اِس پر غور کرنے سے یہہ خیال آتا ہی کہ پتّوں کی اس تقسیم میں کوئی غیر معمولی اور عجیب ترین بات نہیں ہی۔ ریاضی دان صاحب اس پر سوچ سکتے ہیں کہ پتّوں کی ایسی تقسیم کو اتفاقی قرار دینے کے خلاف کونسی باتیں ہیں لیکن باوجودیکہ ایسا اتفاق محال ہی تو بھی اِمکان سے خارج نہیں ہی +

ایک اور مثال یہہ ہی کہ انگریزی بائبل (پیدائیش ۱-۱۱ و ۳) میں کائنات کی گڈمڈ حالت کے بعد کی نئی ترتیب کا ذکر پایا جاتا ہی۔ اس بیان کو چھاپنے کے لئے ۳۲۱۶ حروف، ۳۶، فاصلوں اور ۱۳۰ وقفوں کی ضرورت ہی۔ یا یوں کہیں کہ ٹائپ کے ۴۰۸۲ ٹکڑے درکار ہیں۔ اگر مختلف حروف اور وقفوں وغیرہ کو جدا جدا اشمار کیا جائے تو نو، ۲ قسم کا ٹائپ پایا جاتا ہی مختلف قسم کی ۷، ۲ چیزیں کروڑہا طور پر مرتب ہوسکتی ہیں۔ ریاضی دان بتا سکتے ہیں کہ ۴۰۸۲ چیزیں کتنے مختلف طریقوں میں مرتب کی جاسکتی ہیں۔ کیا اس عبارت پر نظر کرکے اور یہہ دیکھکر کہ یہہ حروف ایسے طور سے مرتب کئے گئے ہیں کہ اُن سے ایک خاص مطلب سمجھ میں آتا ہی اور اگر اسی ترتیب میں مرتب نہ ہوتے تو یہہ مطلب نہ نکلتا کوئی یوں کہہ سکتا ہی کہ چھاپہ خانہ والے نے یہہ حروف اور وقفے وغیرہ ایک صندوق میں رکھے ہوئے تھے اور جب اُس نے اُنہیں نکالا تو اتفاقاً اِس موجودہ ترتیب سے اُس کے ہاتھ میں آئے اور یہہ عبارت بن گئی ؟ اگر دنیا میں

ایک ہی چھاپہ خانہ ہوتا جہاں بائبل چھاپی جاتی تو ممکن تھا کہ یہہ امر اتفاقی ہوتا لیکن اگر دنیا کے مختلف حصوں میں ۲۰ چھاپہ خانوں میں مختلف ٹائپ استعمال کرکے بائبل چھپے اور ہر حالت میں نتیجہ ایک ہی ہو تو امر اتفاقی کا احتمال ناممکن ہوگا۔ اِس مثال میں چھاپنے والے کے پاس حروف کاغذ اور چھاپنے کی مشین تھی۔ اب فرض کرو کہ اُس کے پاس مشین کا کچا سامان اور ٹائپ اور کاغذ ہوتا۔ ایسی صورت میں وہ یہہ کام ہرگز ہرگز اتفاقیہ نہ کرسکتا جس جاہل مطلق نے کبھی کتاب کی صورت نہ دیکھی ہو وہ یہہ خیال کرسکتا ہی کہ کاغذ پر اتفاقاً یہہ سیاہ نشان لگ گئے ہیں لیکن کوئی خواندہ آدمی کسی صورت میں اس کو امرِ اتفاقی قرار نہیں دیگا +

اب یہہ مادی دنیا جس میں زندگی کی کثیر التعداد صورتیں پائی جاتی ہیں اور وہ تمام صورتیں ایک دوسری کی محتاج ہیں اور نہایت ہی عجیب وغریب تراکیب رکھتی ہیں کتاب کے صفحہ سے کہیں زیادہ حیرت خیز ہی۔ اس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے اس کا بغور مطالعہ کیا ہی۔ جاہل کہہ سکتا ہی کہ ہیولیٰ یا کائنات کے ذرات اتفاقاً اِس صورت میں مجتمع ہوگئے ہیں لیکن عالم جانتے ہیں کہ تمام عجائباتِ کائنات کو اتفاقی ظہور تصور کرنا بالکل غلط اور ناممکن ہی۔ ڈاروِن کا خیال ہرگز ایسا نہیں تھا۔ اگرچہ لوگ دنیا کی ترکیب کا بڑا باعث اتفاق بیان کرتے تھے۔ اُسکا خیال یہہ تھا کہ زندگی کی موجودہ صورت اتفاقاً اس پایہ کو نہیں پہنچی بلکہ زمانوں دو مقررہ اُصول پر متواتر ترقی کرتی چلی آئی ہی۔ اور وہ اصول یہہ ہیں (۱) "قدرت کا انتخاب" (۲) "بہتر کی بقا"۔ اُس کے خیال میں یہہ کوئی اتفاقی اصول نہیں تھے جو غیر متواتر اور غیر معین قرار پاسکیں بلکہ یہہ نامعلوم

زمانوں سے متواتر برسرِ کار رہے ہیں اور ان کے نتائج اب دنیا کی موجودہ صورت میں ہمارے پیشِ نظر ہیں +

ڈارون کی تصنیف ''ڈیسینٹ اوف مین'' میں سب سے بڑی دلیل نطفہ یعنے Embryology سے لی گئی تھی۔ اُس میں یہہ بتایا گیا تھا کہ تمام حیوانات میں نطفہ ایک ہی طرح کا ہی اور اس میں کسی طرح کے فرق اور امتیاز کا اِمکان نہیں۔ جب نطفہ جنیں کی صورت اختیار کر کے بڑھتا ہی تب مختلف انواع حیوانات میں فرق نظر آنے لگتا ہی۔ اسی مشابہت سے یہہ استدلال اخذ کیا گیا تھا کہ ابتدائے عالم میں تمام حیوانی زندگی کا اصل ایک ہی تھا۔ بعد میں رفتہ رفتہ مختلف حالات اور تاثیرات کے سبب سے اور قدرتی ''انتخاب'' و ''بقائے بہتر'' کے باعث انواع حیوانات کی مختلف خاص صورتیں ظہور میں آنے لگیں +

نطفہ کی مشابہت ابتک ڈاروینی عقیدہ کے لئے ایک محکم قلعہ ہی۔ ہم اس دلیل کے امکان کو مان لیتے ہیں کہ کسی نوع کی تواریخ اُس نوع کے ایک موجودہ فرد کی تواریخ سے دریافت ہو سکتی ہی لیکن جب ہم یہہ مانتے ہیں اور اس بات کو بھی ممکن تسلیم کر لیتے ہیں کہ تمام موجودہ انواع نے کسی ایک ہی ابتدائی اصل سے بتدریج ترقی کر کے موجودہ صورت اختیار کی ہی تو ہم کو بھی یہہ استدلال کرنے کا حق حاصل ہی کہ مختلف انواع کی موجودہ صورتیں کسی امرِ اتفاقی کا نتیجہ نہیں ہیں اور مذکورہ بالا مشابہت کے مسئلہ سے بھی یہہ نتیجہ نہیں نکل سکتا +

نطفہ کی تواریخ کیا ہی؟ تمام نطفے اپنی ابتدائی حالت میں ایسے یکساں ہیں کہ اُن میں امتیاز کرنا ناممکن ہی لیکن جنیں کی صورت اختیار کر کے اور بڑھکر نطفے جو بالکل مختلف

صورتیں اختیار کرتے ہیں کیا وہ محض اتفاقی یا خارجی تاثیرات کے سبب سے ہیں؟ کیا ہر ایک نطفہ کی تواریخ زیادہ تر یہہ نہیں ہی کہ وہ شروع ہی سے ایسے طور سے رکھا جاتا ہی جس میں ایک خاص طرح کی تاثیر سے موثر ہوتا رہتا ہی اور جب تک اپنی نوع کی خاص صورت اختیار نہیں کر لیتا تب تک تمام مخالف تاثیرات سے پورے طور سے محفوظ رکھا جاتا ہی اور صرف اسی وقت تک نشوونما پاتا ہی جب تک اس خاص حالت میں مخالف اور خارجی تاثیرات سے محفوظ ہوتا ہی۔ اب جائے غور ہی کہ کسی نوع کے کسی فرد کے نشوونما میں اتفاق کی کہاں گنجائش ہی اور اگر اتفاق کو دخل ہو بھی تو اُسکا نتیجہ نطفہ و جنیں کی ہلاکت ہوگی یا کسی خاص صورت میں تکمیل؟ ڈاروینی عقیدہ کے مطابق نطفہ کے متعلق مشابہت تسلیم کرنے پر بھی اس امر کی ضرورت باقی رہتی ہی کہ نطفہ کی خاص حفاظت کیجاوے تاکہ وہ اور صورتوں سے بچ کر اپنی نوع کی صورت اور خواص کو اختیار کرے اور اُن میں ترقی کرے +

(ب) اِدراک۔ یہہ عقیدہ کہ تمام کائنات میں مختلف اوضاع و اشکال کا باعث اتفاق ہی قریباً تمام دنیا میں متروک ہی اور ادراک یعنی قوتِ استدلال کی موجودگی تسلیم کر لی گئی ہی +

بِلا ارادہ؟ جس طرح انسان کی انفرادی ہستی پر غور کرتے وقت پیش آیا تھا اسی طرح اب پھر یہہ سوال پیش آتا ہی ''کیا یہہ قوتِ استدلال مادہ کی ذات و جبلت میں ہی یا اُس سے جدا ہی؟'' چند سال کا عرصہ ہوا ہی کہ ایک عالم نے ایک کتاب موسومہ بہ ''مادہ میں جبلی قوتِ استدلال'' شائع کی تھی۔ اِس کے جواب میں بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں تصنیف ہوئیں

لیکن کوئی معمولی آدمی اُس عالم سے ایک دو سُوال یوں کر سکتا تھا:- (۱) کیا اُسکی کتاب (یعنے کتاب کا مادہ کاغذ و سیاہی) اُس بلا ارادہ قوتِ استدلال کا نتیجہ تھی جو (اُسکے خیال کے موافق) کاغذ و سیاہی کی ذات و جبلت میں تھا جس سے کتاب بنی تھی؟ اسکا جواب مصنّف کی طرف سے ضرور یہہ دیا جاتا کہ کتاب اُس تمام دانائی سمیت جو اسکے ہر ایک صفحہ میں موجود تھی کسی ایسی بلا ارادہ یا با ارادہ قوتِ استدلال کا نتیجہ نہیں تھی جو کاغذ اور سیاہی کی جبلی قوت متصور ہو سکتی بلکہ یہہ اُس قوتِ استدلال کا کام تھا جو کاغذ و سیاہی سے خارج اور مصنف میں موجود تھی- پس اس کتاب میں ہمیں کسی بیرونی اور خارجی قوتِ استدلال کا پتہ ملتا ہی جو کاغذ و سیاہی کی جبلت میں نہیں تھی بلکہ اُس نے اپنی مرضی کے موافق کاغذ اور سیاہی سے کتاب بنائی- پس اس سے ایک ایسی قوتِ استدلال کی ہستی کا اقرار کرنا پڑتا ہی جو مادہ کی جبلت میں نہیں ہی بلکہ مادہ کو اپنی مرضی کے موافق مختلف صورتوں میں تبدیل کرتی ہی- (۲) جب یہہ تسلیم کر لیا گیا کہ کتاب کا وجود اُس قوتِ استدلال کا کام تھا جو کاغذ و سیاہی سے باہر تھی تو دوسرا سوال مصنّف سے یہہ ہوگا کہ وہ قوتِ استدلال جو مُصنّف میں موجود تھی اور جس سے کاغذ و سیاہی نے کتاب کی صورت پکڑی با ارادہ قوتِ استدلال تھی یا بلا ارادہ؟ اب صاف ظاہر ہی کہ مصنّف مذکور اس سوال کا کیا جواب دیگا سائنس یا فلاسفی کی کتاب کا مصنّف غالباً اپنی تصنیف کو بلا ارادہ قوتِ استدلال سے منسوب نہیں کریگا+

با ارادہ؟ پس ہم کو با ارادہ قوتِ استدلال کی موجودگی کا یقین ہوتا ہی اور ہم یہہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہہ قوت انسان کے دماغ میں سکونت پذیر ہو کر مادی دنیا پر تصرف

کر کے مادی اشیا کو اپنی مرضی کے موافق مختلف صورتوں میں تبدیل کر لیتی ہی جبکہ دنیا میں اس قوتِ استدلال کے کافی ثبوت اور نشانات کثرت سے پائے جاتے ہیں تو بلا ثبوت ہی بجائے مادہ میں بلا ارادہ قوتِ استدلال کو فطرتی اور جبلی تسلیم کرنے کے با ارادہ قوتِ استدلال کو ماننا معقول بات ہی+

(ج) رُوح- ہم دُنیا میں اپنے چاروں طرف (ٹھیک جس طرح کہ اپنے آپ میں) اول مادی اشیا دیکھتے ہیں جو بمنزلہ ہمارے مادی اجسام کے ہیں اور دوم احساس جو بمنزلہ ہماری استدلالی قوتوں کے ہیں+

اب کیا اسی قدر کافی ہی؟ کیا ہم ایک ایسی ہستی کے وجود کا ثبوت دے سکتے ہیں جو مادی اور عقلی ہستی سے بالکل مختلف بلکہ ان دونوں پر حکمران ہو جس طرح کہ ہم اپنے آپ میں پاتے ہیں؟ اس مقام پر ہم پھر مشابہت کا خیال کرینگے- میں اپنے آپ میں (دنیا کے ایک نہایت ہی چھوٹے حصّہ میں) دیکھتا ہوں کہ میں اپنی رہائیش گاہ یعنے جسم سے اور اُس قوتِ استدلال سے جو جسم میں ہی بالکل جدا ہستی رکھتا ہوں+

میرے سب دوست کہتے ہیں کہ انکا بھی یہی حال ہی اور جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں اور لوگوں کی حالت بھی ہم صاف ایسی ہی دیکھتے ہیں کہ آدمی اپنے جسم اور عقلی قوتوں سے بالکل جُدا ہستی رکھتا ہی- دنیا کے جن اجزا سے ہم واقفیت رکھتے ہیں اگر انکا فی الحقیقت یہہ حال ہی تو مشابہت کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کل دنیا کا مجموعی طور پر یہی حال ہی اور کائنات کے مادی اور دیدنی حصہ سے بڑھکر اور اُس مادی دنیا میں جس عقل کا ہم نے پتہ لگایا ہی اُس سے برتر ایک ہستی یا شخصیت ہی جو

تمام کائنات کی مالک ہی۔ لہذا میں ہوں اور تو ہی کی حقیقت کی بنا پر ہم وہ ہی بھی کہہ سکتے ہیں +

نتیجہ لیکن اگر یہہ سچ ہی تو بعض پوچھینگے جیسا کہ ایک دوست نے میرا یہہ مضمون دیکھکر پوچھا تھا کہ اُس نے اپنی ہستی کا ایسا ثبوت کیوں نہیں دیا جس پر چون وچرا کی گنجائش نہوتی؟ اس کا جواب صرف یہہ ہی کہ وہ ہماری استدلالی قوتوں کو بالکل نیست کئے یا سخت نقصان پہنچائے بغیر ایسا نہیں کر سکتا تھا ہم بدیہی یا استدلال سے مستغنی معاملات پر کبھی بحث نہیں کرتے اور جس قدر ہماری قوتِ استدلال کی مشق نہیں ہوتی اُسی قدر وہ کمزور ہوتی چلی جاتی ہی۔ لہذا یہہ شخص جس کو ہم اب سے خدا کہینگے اپنی ہستی کا ناقابل اعتراض ثبوت نہیں دے سکتا تھا جب تک ہماری خود عطا کردہ استدلالی قوتوں کو سخت نقصان نہ پہنچاتا میرے دوست نے اس دلیل کے زور کو محسوس کر کے کہا خیر۔ اگر ثبوت ذرا اور صریح ہوتا تو میرے خیال میں بہتر تھا" +

میرا طریق استدلال منطقی ہو یا نہو خدا کی ہستی کا ثبوت اُن لوگوں کیلئے جو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کافی دیا گیا ہی۔ سر آئزک نیوٹن خدا ہی کی ہستی کا بالکل قایل تھا۔ اس زمانہ میں میں نے اپنی کیمبرج یونیورسٹی کے ایسے اصحاب کو دیکھا ہی۔ مثلاً پروفیسر آدمس صاحب جو علم ریاضی کے وسیلہ سے نیپٹون سیارہ کو دریافت کرنے والوں میں سے ہیں۔ پروفیسر کیلی صاحب اُس دار العلوم کے سب سے بڑے ریاضی دان۔ پروفیسر کلارک میکسول صاحب علمِ بائی آلوجی کے ایک سب سے بڑے عالم۔ پروفیسر سیجوک صاحب جو علم طبقات الارض کے باپ کہلاتے ہیں اور سر جارج سٹوکس صاحب جو زمانہ حال کے

سر کردہ سائنس دان ہیں۔ یہہ سب عالم اصحاب نہ صرف خدا پر ایمان رکھتے تھے بلکہ دل کی حلیمی اور فروتنی سے مسیح کی پیروی کرتے تھے۔ اب میں یہہ تو نہیں کہتا کہ چونکہ یہہ بڑے بڑے عالم جو عقلی قوتوں میں معمولی آدمیوں سے بہت ہی بڑھکر تھے خدا کی ہستی کے پورے طور سے قائل تھے اسلیئے ہم کو بھی خدا پر ایمان لانا لازم ہی لیکن میں یہہ کہتا ہوں کہ خدا کی ہستی کا جو ثبوت ہم سے بڑے دانشمندوں نے کافی تسلیم کیا ہم اُس کو ناقص یا غیر کافی نہیں کہہ سکتے ہیں۔ ان علما کی شہادت پر میں ہربرٹ سپنسر کی شہادت کو زائد کیا چاہتا ہوں:-

"وہ بعید الفہم رموز جن پر جسقدر زیادہ سوچا جائے اسی قدر زیادہ بعید الفہم ہوتے جاتے ہیں۔ اُن میں ہمیشہ یہہ ایک کامل یقینی حقیقت ہی کہ آدمی ہمیشہ اُس لامحدود کے حضور میں ہی جو ساری کائنات کا منبع و سرچشمہ ہی"۔ ایک ہندوستانی اخبار اس عبارت کو زمانہ حال کی فلاسفی کے خلاصہ کے طور پر اقتباس کر کے کہتا ہی "ہم نے یہی بات پہلے بھی سنی ہی لیکن صرف الفاظ میں کچھ فرق ہی مطلب ایک ہی ہی۔ یعنے ابتدا میں خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا" +

پس ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک کے لئے دو مطلق حقیقتیں ہیں یعنے **میں ہوں اور وہ ہی**۔ اور چونکہ وہ ہی اسلئے میں ہوں +

پھر جس طرح مادی دنیا میرے جسم کے لئے خوراک مہیا کرتی ہی اور جس طرح سے وہ عقلی آثار جو مادی دنیا میں پائے جاتے ہیں میری عقلی قوتوں کے لئے پرورش کے سامان بہم پہنچاتے ہیں اُسی طرح سے ضرور ہی کہ وہ خود میری رُوح کیلئے زندگی

کی روٹی ہو۔ جسم کی توانائی کا انحصار خوراک کے موجود ہونے پر نہیں بلکہ اُس کو کھاکر اپنے ساتھ ملا لینے پر ہی۔ عقلی ترقی کا دارومدار قابلِ غور اشیا کے آس پاس موجود ہونے پر نہیں بلکہ اُن پر سوچنے اور اُن کے علم کو حاصل کرکے اپنے آپ سے ملا لینے پر ہی۔ اِسی طرح سے میری رُوح بھی صرف اِس بات سے کہ خُدا ہی یا محض اِس سبب سے کہ عقل خُدا کی ہستی کو قرینِ قیاس تسلیم کرتی ہی زندگی اور تقویت نہیں پا سکتی بلکہ زندگی اور تقویت حاصل کرنے کے لئے ضرور ہی کہ خُدا اسے رشتہ رکھے اور اُسے اپنے آپ میں لے لیوے یا یوں کہیں کہ صرف یہہ جاننا کافی نہیں کہ خُدا ہی بلکہ جیسا کہ میرے مسلمان دوست نے کہا تھا ضرورت اس بات کی ہی کہ ہم اُسکو جانیں۔ یہہ علم میری ہستی کے سب سے ضروری حصّہ کے لئے زندگی ہوگا۔ اب ہم دوسرے سوال پر غور کرینگے کہ ہم خدا کو کس طرح جان سکتے ہیں؟

سوال

دوسرا

خدا کو جاننا

ہمارا دوسرا سوال یہہ ہونا چاہئے کہ ہم خدا کو کس طرح جان سکتے ہیں؟ کیونکہ اگر اُس کی ہستی پر معقول دلائل ہیں تو ہر ایک ذی ہوش کی یہہ خواہش ہوگی کہ اگر ممکن ہو تو اُسے جانے ❊

اُس کے کاموں کے وسیلہ سے اُس کو جاننے کا پہلا اور زیادہ ظاہر طریق اُس کے کاموں کا مطالعہ ہی۔ یعنے اُن مادی اشیا کا مطالعہ جو ہماری چاروں طرف ہیں اور جن میں عقلی قوتوں کی علامات اظہر من الشمس ہیں۔ نہایت قدیم زمانہ سے بنی آدم کا یہی خیال چلا آیا ہی:۔

”آسمان خدا کا جلال ظاہر کرتے ہیں اور فضا اُس کی کاریگری دکھلاتی ہی۔ ایک دن دوسرے دن سے بیان کرتا ہی اور ایک رات دوسری رات کو آگاہی دیتی ہی۔ اُن کی کوئی بولی اور لغت نہیں ہی اور اُن کی آواز سنائی نہیں دیتی“ ❊

آخری فقرہ کے مختلف ترجمے ہیں مثلاً ”اُن کی کوئی زبان اور لغت نہیں تو بھی کیا اُنکی آواز سنائی نہیں دیتی؟“ ”کوئی زبان اور لغت ایسی نہیں ہی جہاں اُن کی آواز سنائی

نہ دیتی ہو۔"

"خدا کی بابت جو کچھ معلوم ہوسکتا ہی وہ انسان میں ظاہر ہی کیونکہ خدا اپنے تئیں انسان میں ظاہر کرتا ہی کیونکہ ابتدائے آفرینش سے اُس کی نادیدنی چیزیں اُسکی مخلوق دیدنی اشیا میں صاف طور سے نظر آتی ہیں یہاں تک کہ اس کی ازلی قدرت اور الوہیت بھی"۔

ہندوستان میں خدا کو اُس کے ہاتھوں کے کاموں یعنے فطرت یا نیچر میں ڈھونڈنے اور پانے کا خیال بہت ترقی کر رہا ہی۔ بہت سے لوگ نیچری کہلاتے ہیں۔ وہ صرف انہی باتوں کو مانتے ہیں جنکا علم نیچر سے حاصل ہوسکتا ہی لیکن افسوس کی بات ہی کہ ان نیچریوں میں سے بہت سے اپنے آس پاس کی نیچر پر کبھی غور و فکر نہیں کرتے۔ اب ہم ذرا اس پرانے سوال پر غور کریں کہ "کیا ہم تلاش کرنے سے خدا کو پا سکتے ہیں"؟

ہاں چند شرائط کے ساتھ ہم دیکھینگے کہ اگرچہ یہہ طریقہ پہلے پہل بہت اچھا معلوم ہوتا ہی تو بھی بہت ہی ناقص ہی۔

(۱) سب سے پہلے ہم کو یہہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ ہم خدا کی دستکاری یا نیچر کا مطالعہ کس حیثیت میں ہو کر کرتے ہیں۔ یہہ ضروری امر ہی کہ ہم اپنی نسبت کوئی غلطی نہ کریں۔ خداشناسی کے میدان میں نکلنے سے پیشتر مناسب ہی کہ ہم اپنے آپ کو اور اپنی محدود طاقتوں کو خوب پہچان لیویں۔ منجموں کو چاند کا فاصلہ دریافت کرنیکی غرض سے زمین پر رصدگاہیں قائم کرنے سے پیشتر رصدگاہوں کا باہمی فاصلہ نہایت صحت کے ساتھ دریافت کرنا ضروری ہی۔ اگر اس امید اور گرینج کی رصدگاہوں

کے فاصلہ میں ایک میل کی غلطی ہو تو اُن رصدگاہوں سے چاند کے فاصلہ کا اندازہ کرنے میں بڑی بھاری غلطی پڑیگی۔ اگر ہم اپنی نسبت یا اپنے ذرائع معلومات کی نسبت کوئی غلطی کرینگے تو ہمارے اندازے اور تخمینے بہت غلط ہو جائینگے اور اشیا اپنی اصلیت کے برعکس معلوم ہونگی مثلاً زمانۂ سلف کے منجمین زحل۔ مریخ اور مشتری وغیرہ سیاروں کی حرکت کی نسبت بہت مغالطوں میں پڑے ہوئے تھے۔ وہ اُنکی معکوس یا بازگشتی حرکت مانتے تھے کیونکہ یہہ سیارے آسمان میں اپنے مدار پر حسب معمول گردش کرنے کے بجائے بعض اوقات ساکن معلوم ہوتے ہیں اور بعض وقت ایسا معلوم ہوتا ہی کہ وہ اپنے مدار پر واپس جا رہے ہیں۔ بعض وقت وہ بڑی تیزی سے آگے کو بڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور کبھی نہایت دھیمی رفتار سے ستاروں میں چلتے ہیں۔ جب تک زمین نظام شمسی کا مرکز تسلیم کی جاتی تھی تب تک یہہ بیقاعدہ حرکات سمجھ میں نہیں آتی تھیں اور اس خیال کی تردید ہوتی تھی کہ تمام سیارے ستارے اپنے مدار پر ہمیشہ باقاعدہ اور متواتر گردش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب یہہ ثابت ہو گیا کہ زمین مرکز نہیں ہی بلکہ اور سیاروں کی طرح یہہ بھی سورج کے گرد گردش کرتی ہی تو تمام غلطفہمی رفع ہو گئی۔ مذکورہ بالا بیقاعدہ حرکات کا نظر آنا اُن سیاروں کی حرکت کے سبب سے نہیں ہی کیونکہ وہ ہمیشہ باقاعدہ حرکت کرتے رہتے ہیں بلکہ اسکا باعث خود زمین کی حرکت ہی۔ زمانۂ سلف کے منجمین کی غلطی یہہ تھی کہ وہ ان سیاروں کو متحرک رصدگاہ سے دیکھتے تھے۔ ریل گاڑی سے بچوں اور ایسے عمر رسیدہ لوگوں کو بھی جو ریل گاڑی کے سفر کے عادی نہیں ہیں ایسا معلوم ہوتا

ہی کہ درخت بھاگے جارہے ہیں۔ چنانچہ ایک ہندوستانی لیڈی نے اپنے ریل گاڑی کے پہلے سفر کا یوں بیان کیا "ہم لکڑی کے چھوٹے چھوٹے گھروں میں بیٹھ گئے اور زمین بھاگنے لگی"۔ ہم ایسی باتیں سنتے ہیں جو محبت و انتظام کے خدا پر ہم طرح کے ایمان کی مخالفت اور تردید کرتی ہیں۔ کیا یہہ ممکن نہیں ہی کہ ہم بھی اُن پرانے منجمین کی طرح غلطی کر رہے ہیں؟ اپنے زعم میں ہم مرکز پر کھڑے ہو کر کائنات پر نظر کر رہے ہیں درحالیکہ ہماری قیام گاہ بالکل متزلزل اور غیر مستحکم ہی۔ اگر ہم اس کی اخلاقی دنیا کا مرکز دریافت کرسکتے اور وہاں سے تمام نیچر کو جانچتے تو ممکن تھا کہ ہمکو کوئی بیقاعدہ یا معکوس حرکت نظر نہ آتی بلکہ تمام چیزوں میں باقاعدگی اور دائمی قانون نظر آتے۔

۲- پھر یہہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ ہم کسی آدمی کے افعال کی نسبت اپنی کوئی رائے قائم نہیں کرسکتے جب تک کہ ہم اس کی نیت اور دلائل کو نہ جانتے ہوں جس سے اُس کے افعال وقوع میں آئے ہیں۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک ذہین آدمی جو کہ علم جراحی سے بالکل ناواقف ہی میدان جنگ میں جاوے اور وہاں جراح کو زخمی سپاہیوں کے مجروح اعضا کو کاٹتے دیکھے تو کیا فوراً اُس کو یہی خیال نہیں آئیگا کہ جراح بیچارے زخمیوں پر بے رحمی کر رہا ہی؟ لیکن جب سبب تبلا دیا جاوے اور یہہ اچھی طرح سے سمجھا دیا جاوے کہ جراح کی نیت نیک ہی اور وہ یہہ چاہتا ہی کہ ایک عضو کاٹکر باقی تمام جسم کو بچاوے تو وہی کام جو پہلے ظلم اور بیرحمی کا کام معلوم ہوا تھا رحم اور دانائی کا کام معلوم ہوگا۔

کیا ہمارا حال بھی کسی قدر ایسا ہی نہیں ہی؟ ہم ایک کتاب اُٹھا کر پڑھتے ہیں جو خدا کیطرف سے الہامی ہونے کا دعوے کرتی ہی لیکن اُس میں خدا ایک قوم کو نہائیت بیرحمی سے نیست و نابود کرنے کا حکم دیتا ہی۔ ہم فوراً پکار اُٹھتے ہیں "یہہ بڑی بیرحمی ہی! یہہ کتاب ہرگز خدا کی طرف سے نہیں ہوسکتی"۔ ہم اِس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ جب کسی قوم کا دین خراب ہو جاتا ہی تو اُس کی عملی زندگی میں بھی خرابی پیدا ہو جاتی ہی اور بد اخلاقی کی ناگفتنی خرابیاں اُس کے تمام افراد میں پھیل جاتی ہیں اور آس پاس کی جن اقوام سے اُن کا کچھ تعلّق ہوتا ہی اُن میں بھی یہہ خرابیاں نہائیت سرعت سے سرائیت کرجاتی ہیں۔ ایسی قوم کا نیست و نابود کیا جانا کسی عضو کے کاٹے جانے کی طرح بیرحمی نہیں بلکہ اعلٰے درجہ کا رحم ہی کیونکہ اس کے سبب سے بدی کی اشاعت بند کی جاتی ہی۔

۳- پھر ہم کو یہہ تیسری بات بھی خوب یاد رکھنی چاہئے کہ اگرچہ ہم انسان کے افعال سے کیسی ہی پختہ واقفیت حاصل کرلیں تو بھی انسانی ماہیّت کے عرفان سے منزلوں دور رہتے ہیں۔ کیا کوئی آدمی لوکوموٹو انجن کی ترکیب و ساخت کے مطالعہ سے اُس کے موجد کی ایجادی لیاقت کا عرفان حاصل کرسکتا ہی؟ انجن کے مطالعہ سے وہ ہرگز ہرگز یہہ نہیں کہہ سکتا کہ "میں جارج سٹیفنسن کو جانتا ہوں"۔ نپولین کی فتوحات کے مطالعہ سے کیا ہم اُس کی قانوندانی اور سپہ سالاری کی لیاقت سے بڑھکر کسی بات کے قائل ہوسکتے ہیں؟ بنی آدم کی شخصی حیثیت کو پہچاننے کے لئے ضرور ہی کہ یا تو ہم براہ راست اُنہی سے شخصی تعلّق رکھیں یا اُن لوگوں سے ہمارا واسطہ ہو جو اُن سے شخصی تعلق رکھتے

ہوں- آدمی کے افعال اور اُس کی تصانیف سے اُسکا کچھ حال معلوم ہو سکتا ہی لیکن اُس کی ذات کا حقیقی علم اِن وسایل سے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا- اِسی طرح اگرچہ ہم تمام علوم کو جانیں اور تمام نیچری رموز سے آگاہ ہوں اور کائنات کے صورت گر سے بہت کچھ آگاہی حاصل کریں تو بھی ہم اُس کی ذات کے عرفان سے منزلوں دور ہونگے +

اِن خیالات پر غور کرنے سے ہم کو معلوم ہو جائیگا کہ خدا کی ذات کا اظہار جو اُس کے کاموں کے وسیلہ سے ہوتا ہی ناکمل ہی اور اُسکے ساتھ ایک اور خیال کو شامل کرنا ضروری ہی:-

خدا کے کاموں کی بابت ہم جو کچھ جانتے ہیں یعنے قوانین نیچر کا ہم کو جو علم ہی وہ ناقص ہی اور اگر ہم قوانین نیچر کے اس علم کے مطابق اُسکا خیال کریں تو ممکن ہے کہ اُس کی شخصی حیثیت کے اندازہ میں سخت غلطیاں کریں- جن باتوں کو ہم "علمی حقایق" کے نام سے نامزد کرتے ہیں وہ اکثر ہمارے آبا و اجداد کے زمانہ کے "علمی حقایق" کی تردید کرتی ہیں- اُن حقایق سے وہ لوگ جن نتایج پر پہنچے ہم کو اُن کی تردید کرنا ہی- اسی طرح سے ممکن ہی کہ آیندہ پشت کے لوگ ہمارے "علمی حقایق" اور اُن نتایج کی جو ہم اِن حقایق سے خدا کی شخصی حیثیت کی بابت نکالتے ہیں تردید کریں- اب شاید کوئی یہہ کہے کہ صرف صبر درکار ہی سب کچھ آپ ہی معلوم ہو جائیگا- گذشتہ سو سال کے عرصہ میں سائنس نے بڑی نمایاں ترقی کی ہی اور آیندہ سو سال میں غالباً اِس سے بھی زیادہ ترقی ہوگی- یہہ مانا لیکن اس معاملہ میں ہمارے بڑے بڑے

سائنس دان کس نتیجہ پر پہنچے ہیں؟ پروفیسر ٹنڈل الپائن پر چڑھنے میں بڑا مشہور تھا- اُس نے ایک دفعہ اثنائے گفتگو میں ایک دوست سے کہا کہ سائنس نے ہم کو صرف ایک دشوار گذار وادی کے کنارہ پر پہنچایا ہی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ بہت سا علم ہنوز باقی ہی لیکن سائنس کے وسیلہ سے ہم اُس کو دریافت یا حاصل نہیں کر سکتے ہیں- پھر ایک اور مشہور سائنس دان لارڈ کیلون نے گذشتہ صدی کے خاتمہ پر سائنس کی صد سالہ ترقی کا بیان کرتے وقت فرمایا کہ جو کچھ ہم نے سیکھا ہی اُس سے بڑھکر حیرت خیز وہ علم ہی جو ہم نے اب تک حاصل نہیں کیا اور جس کے وجود پر ہمارا موجودہ علم دلالت کرتا ہی- یہہ عام تجربہ کی بات ہی کہ جس قدر ہم اپنی زندگی میں قدم بقدم علم میں ترقی کرتے ہیں اُسی قدر ہم کو معلوم ہوتا جاتا ہی کہ اور بہت کچھ سیکھنا باقی ہی- جسقدر آدمی علم کے پہاڑ کی بلندی پر پہنچتا ہی اُسی قدر اُس کو نامعلوم علوم کے وسیع میدان صفائی سے نظر آنے لگتے ہیں- اگر اس صدی میں سائنس کی معلومات میں متواتر ترقی ہو رہی ہی تو گمان غالب ہی کہ اس صدی کے اختتام پر کوئی سائنس دان نامعلوم علوم کے وسیع تر میدانوں کی طرف ہم کو متوجہ کریگا جو ہماری ترقی کے سبب سے نظر آنے لگینگے +

ایسا معلوم ہوتا ہی کہ سائنس کے وسیلہ سے ہم کو قوانین و اصول نیچر کا بھی پورا علم حاصل نہیں ہو سکتا اور اگر یہہ بات یوں ہی ہی تو نیچر کے مالک یعنے خدا کا پورا علم سائنس کے وسیلہ سے ہرگز ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا +

سائنس کا استعمال- لیکن سائنس جو کچھ نیچر اور قوانین نیچر کے بارہ

ہیں سکھاتی ہی اُسکا مطالعہ ترک نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ایسی روش ہم کو ہرگز ہرگز منزل مقصود کی طرف نہیں لیجائیگی۔ جو قوانین و اُصول نیچر میں پائے جاتے ہیں اُن کا کچھ علم حاصل کرنا بہت سے ضروری امور کے باب میں صحیح رائے رکھنے میں مدد دیتا ہی اور اِسلیئے بہت ہی گراں بہا اور قابلِ قدر ہی ✣

ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی تواریخ کے شروع ہی سے بنی آدم کا یہہ اعتقاد چلا آیا ہی کہ چونکہ وہ خود اپنی کوشش سے خدا کے حضور کی بلندی پر نہیں پہنچ سکتے اِسلیئے خدا خود دنیا میں آکر اپنے تیئں اُن پر ظاہر کریگا۔ علاوہ بریں دنیا میں بہت سی کتابیں ہیں جنکا یہہ دعویٰ ہی کہ اُن کی مندرجہ تعلیمات خدا کی طرف سے بنی آدم کیلیئے ہیں۔ لیکن فی الحال ہم ایسی بات کے اِمکان پر غور نہیں کرینگے بلکہ صرف اِس حقیقت کی طرف متوجہ ہونگے کہ دُنیا میں بہت سے مذاہب ہیں جو خدا کی طرف سے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اِن مذاہب میں سے بعض کی بنیاد اُن کتابوں پر ہی جن کو ہم خود ردو قبول کے فیصلہ کے لیئے پرکھ سکتے ہیں۔ ہم اِن کتابوں کو کس طرح پرکھیں؟ نیچر کی کتاب کے وسیلہ سے جو ہمارے پاس موجود ہی۔ نیچر تو لا کلام خدا کی طرف سے ہی اگر اُسی مصنّف کی کوئی دوسری کتاب بھی دُنیا میں ہی تو وہ پہلی کتاب کا تکرار نہیں ہوگی اور نہ پہلی کتاب کے مضامین اُسکا موضوع ہونگے۔ کیونکہ کوئی مصنّف ایک ہی مضمون پر دو کتابیں نہیں لکھتا۔ بلکہ اِس دوسری کتاب میں سلسلہ اور طرز تحریر پہلی کتاب کا سا ہوگا جس سے معلوم ہو جائیگا کہ یہہ اُسی مصنّف کی تصنیف ہی۔ فرض کرو کہ اب جارج سٹیفنسن یا نپولین کی تصانیف کے نام سے کچھ کتابیں شایع کی جائیں

ہم اُن کو کس طرح پرکھینگے؟ جو کتاب جارج سٹیفنسن کی تصنیف کے نام سے طبع ہوئی ہی اگر وہ مکینکس کے مضمون سے بحث کرے تو ہم اُس کی دیگر تصانیف کے علم کی مدد سے بآسانی معلوم کر سکینگے کہ آیا یہہ اُس کی تصنیف ہی یا نہیں۔ اِسی طرح سے نپولین کی معرکہ آرائیوں اور جنگ آزمائیوں کے علم کی مدد سے ہم بتا سکینگے کہ جو کتاب اُسکی تصنیف کے نام سے طبع ہوئی ہی فی الواقع اُس کی تصنیف ہی یا نہیں۔ جن کتابوں میں اُس کے اصول و قواعد جن پر وہ عمل کرتا تھا موجود نہوں وہ اُس کی تصانیف نہیں ہو سکتی ہیں۔ اگر بہت سی کتابیں پیش کیجاویں اور اُن میں سے اسکی تصنیف کو منتخب کرنا ہو تو ہم اُسی کتاب کو منتخب کرینگے جس میں اُس کے اصول و قواعد بہت صفائی سے نظر آئینگے۔ باقیوں کو ہم ضرور رد کر دینگے ✣

پس اِسی طرح جو کتاب ہم کو تمام کائنات کے خالق سے آشنائی بخشتی ہی ہم بیشک اُسکو قبول کر کے اُس کے وسیلہ سے اُس کی بابت اِسقدر زیادہ سیکھ سکتے ہیں جو اُس کے کاموں کے ذریعہ سے نہیں سیکھ سکتے تھے۔ لیکن اگر ہم کو اِس کتاب میں وہ اُصول و قواعد نظر نہ آویں جو اُس کے تمام کاموں میں پائے جاتے ہیں تو ہم ضرور اِس کتاب کو رد کرینگے۔ اگر بہت سی کتابیں ہمارے سامنے پیش کی جاویں تو ہم وہی کتاب منتخب کرینگے جس میں اُس کے اصول و قواعد زیادہ صفائی اور صراحت سے پائے جائینگے۔ سائنس نے ہمارے سامنے نیچر کی کتاب کھول دی ہی جس کے مُصنّف کے بارہ میں کوئی بحث باقی نہیں ہی۔ اِسکے وسیلہ سے ہم اُن تمام کتابوں کو پرکھ سکتے ہیں جو خُدا کی طرف سے ہونے کا دعویٰ

کرتی ہیں +

الہامی کتاب کے اصول پر بحث کرنے سے پیشتر تھوڑی دیر کے لئے ہم ایک اور بات پر غور و فکر کرینگے +

کیا انسانی فطرت میں؟ اگر خدا کا عرفان خارجی دنیا سے حاصل نہیں ہو سکتا تو کیا ہم اپنی متخیلہ یا اخلاقی ہستی میں اُس کو تلاش نہیں کر سکتے؟

بہت سے لوگوں نے بلا ارادہ یا ارادتاً اِس خیال کی پیروی کی ہے۔ وہ یہہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جس طرح اُن کی اخلاقی اور روحانی ہستی خدا کی طرف سے ہے اُسی طرح اُس کی ہستی کا سراغ اُن میں پایا جا سکتا ہے۔ اُنہوں نے عبادت کے لئے اپنی ہی ذات سے معبود گھڑ لیا ہے۔ یہہ وہی قاعدہ ہے جسکی نیچری دین کے حامی پیروی کرتے ہیں۔ فرق صرف یہہ ہے کہ نیچری دین کے حامی تمام کائنات سے ہدایت طلب کرتے ہیں اور یہہ لوگ کیرکٹر انسانی کو اپنا ہادی جانتے ہیں۔ جو اعتراض نیچری مذہب پر ہو سکتا ہے وہی اِس طریق پر کیا جا سکتا ہے۔ یہہ تو بیشک سچ ہے کہ ہماری اخلاقی ہستی میں خدا کی عجیب صنعت کا پتہ ملتا ہے لیکن اس سے صرف اُس کی چند صفات کا سراغ ملتا ہے۔ اُس کی ذات کا عرفان حاصل نہیں ہو سکتا۔ اِنسان کی اخلاقی ہستی کا مادہ بھی خالص نہیں بلکہ اُس میں بہت سا کھوٹ ہے اور یہہ کھوٹ اصل مادہ سے ایسا خلط ملط ہو گیا ہے کہ انسان دونوں میں ہمیشہ تمیز نہیں کر سکتا اور کھوٹ کو اصل قیمتی مادہ تصور کر کے وہ خطائیں اور غلطیاں جو اپنی ذات میں پائی جاتی ہیں اپنے ایجاد کئے ہوئے خدا سے منسوب کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ معبود کے

مفروضہ اخلاق اور عابد کی اخلاقی حیثیت کے لئے نہایت ہولناک ہوتا ہے کیونکہ انسان جسکا مداح اور عابد ہوتا ہے طبعاً اُسی کی مانند بنتا جاتا ہے لہذا جو عیوب معبود کی ذات میں ہونگے وہ عابد کی ذات میں پیدا ہو کر نہایت سریع اور مبالغہ آمیز ترقی کرینگے +

زمانہ سلف کے اہل میکسیکو۔ جنہوں نے اہل سپین کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ ایسے لوگ تھے جن میں وقت اور حالت کے مؤثر اسباب نے جنگی بہادری کا وصف پیدا کر دیا تھا۔ اُنہوں نے اپنے آپ میں یہہ وصف دیکھکر اپنے مقبول معبود کو بھی ایسے ہی اوصاف سے متصف کیا۔ پھر دائمی جنگ آرائیوں سے اُسے خوش کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ جنگ آرائی اور خونریزی جو پہلے اُن کی نسل کی بقا کا وسیلہ تھی اب اُن کی دل لگی اور تفریح اور اُن کے معبود کی خوشنودی کا موجب ہو کر آخر کار اُن کے تمام ملکی معاملات کی علتِ غائی قرار پائی یہانتک کہ انجام کار صرف اِس غرض سے لڑائی ہوا کرتی تھی کہ معبود کے سامنے قربانیاں گذراننے کے لئے لوگوں کو اسیر کریں۔ کسی معبود کی عبادت کرنے کی خواہش اُن کے اندر ہی سے پیدا ہوئی اور اُنہوں نے اپنے معبود کو اپنے ہی اوصاف اور خواص سے متصف کیا اور نتیجتہً اُن میں نہایت قبیح عادات و خواص پیدا ہو کر راسخ ہو گئے +

ہندوستان کے ٹھگ بھی اِسی عظیم مغالطی کی نظیر تھے۔ وہ خود خونریزی کو بہت ہلکی بات سمجھتے تھے۔ ایسے ہی خیالات و احساس اُنہوں نے اپنے معبود سے

منسوب کئے اور آخر کار اِن قبیح خیالات نے اِن میں ایسا زور پکڑا کہ ہر سال ہزاروں
مسافر اِن خونریز بدشعاروں کے ہاتھوں سے قتل ہو کر اِن کے معبود کے سامنے
قربانی گذرانے جاتے تھے ؛

ایک اور نظیر محمد صاحب کے حالات سے ملسکتی ہے۔ اُن کی ترتیب اور پرورش بُت
پرستوں میں ہوئی۔ اُنہوں نے بھی اور بہت سے لوگوں کی طرح محسوس کیا کہ
جن بتوں اور معبودوں کی میرے اہلِ وطن پرستش کرتے ہیں میری نیچر کا
صدور اُن سے نہیں ہے۔ جب اُنہوں نے اپنے آپ میں نظر کی تو اپنے تئیں
اُن تمام معبودوں سے جن کی اُن کے ہم قوم پرستش کرتے تھے بہتر اور افضل
پایا۔ وہ اپنے خالق خدا کو کہاں پاتے؟ یہود و نصاریٰ کی خراب شدہ تعلیم
جو اُنہوں نے سُنی اُس سے بھی اُن کی تسلّی نہوئی۔ اُنہوں نے اپنے خالق کی
تلاش میں (بلا ارادہ) اپنی ہی ہستی پر غور و فکر کرنا شروع کیا۔ اِس کا نتیجہ یہہ ہوا
کہ قرآنی خدا محمد صاحب کی اپنی ذات کی تصویر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہہ تصویر
نہایت درستی سے کھینچی گئی ہے اور اُس میں ایک شہری عرب کی تمام ذاتی خوبیاں
اور برائیاں دکھائی گئی ہیں۔ جوں جوں قرآن ایک ایک سورۃ کرکے بڑھتا گیا اور
جس طرح محمد صاحب تصویر کو مکمل کرتے گئے ویسے ہی صاف طور سے تشبیہ
بھی تکمیل پکڑتی گئی جہانتک کہ آخر کار محمد صاحب نے خود اس بات کو محسوس
کیا۔ سورۂ توبہ کی آخری آیت میں وہ اپنے تئیں ایسے دو اوصاف سے
متصف کرتے ہیں جو اس مقام کے سوا تمام قرآن میں خدا ہی کیلئے استعمال

ہوتے چلے آئے تھے۔ چنانچہ مرقوم ہے "لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز
علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رؤف الرحیم"۔ یعنے تمہیں میں کا ایک
رسول تمہارے پاس آیا ہے۔ تمہارا تکلیف پانا اُسے گراں گذرتا ہے اور وہ تمہیں تلاش
کرتا ہے۔ ایمان والوں پر شفیق اور رحیم ہے۔ رؤف اور رحیم دونوں ایسے اوصاف
ہیں جن کے تاج سے محمد صاحب تمام قرآن میں اپنے معبود کے سر کو زینت دیتے
ہیں لیکن اِس آیت میں وہ اِن کو اپنے حق میں استعمال کرتے ہیں۔ محمد صاحب نے
جو خدا کی تصویر کھینچی تھی اب اُس میں اور اپنے آپ میں مشابہت محسوس کی اور
اسکا نتیجہ یہہ ہوا کہ اپنے چند اوصاف سے خدا کو متصف کیا اور وہی اوصاف آپ
کے چال چلن اور آپ کی ذات میں روز افزوں ترقی کرتے گئے اور آپ کے
مومنین کا بھی بہت کچھ یہی حال ہوا۔ ہر ایک سچے محمدی میں چند خاص خوبیاں اور
خاص برائیاں ہیں کیونکہ وہ اپنی زندگی کو اُس نمونہ کے موافق بناتا ہے جو محمد صاحب
نے اُس کے سامنے رکھا ہے۔ ایسا مذہب جو حسن و قبح دونوں کو معبود سے منسوب
کرے اور انسانی جبلت کی برائیوں کو الٰہی اوصاف قرار دے ہرگز ہرگز انسان کو
اُس کی ذاتی برائی سے نجات نہیں دے سکتا اور جو عقیدہ اخلاقی اور روحانی
بہبودی کے لئے معتقدین کے دل میں خاص قوت کا کام نہیں کرتا بلکہ برخلاف
اس کے اخلاقی ہستی میں بعض برائیاں پیدا کر دیتا ہے وہ ہر چند عام فہم اور بظاہر
مرغوب ہو فوراً رد کیا جانے کے لائق ہے کیونکہ وہ انسانی طبیعت کی کمزوریوں کو
دور کرنے کے لئے خدا کی طرف سے تجویز نہیں کیا گیا ؛

جو قوانین اور شرائع ہمارے چاروں طرف پائے جاتے ہیں۔ اب ہم اُن میں سے ایک کے وسیلہ سے خدا کو ڈھونڈنے کے مذکورہ بالا طریق کو پرکھینگے۔ جس دنیا میں ہم رہتے ہیں کیا یہہ اپنی اندرونی قوت سے قائم رہتی اور پھل لاتی ہے؟ نہیں۔ بلکہ اس کی سطح پر بقائے حیات کے لئے روشنی اور گرمی باہر سے آتی ہیں۔ کیا اس کی سطح پر کوئی پودا یا کوئی جاندار اپنی پرورش کا سرمایہ اپنی ہی ذات میں رکھتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ ہماری جسمانی زندگی کا دارومدار اس پر ہے کہ خارجی اشیا کا کچھ حصہ اپنے آپ سے ملالیں۔ اس قانون کی رو سے ہم کہہ سکتے کہ ہماری اپنی ہی ذات سے عرفانِ الٰہی حاصل کرنے کا خیال غلط ہے۔ اس عرفان کا تخم تو ممکن ہے کہ ہم ہی میں ہو جیسا کہ گیہوں کے دانہ میں زندگی موجود ہے لیکن اس کے کامل اظہار اور پورے نشوونما کے لئے خارجی قوت کی ضرورت ہے +

الہام سے

کیا انسان خدا کو جان سکتا ہے؟ اس میں تو ذرا بھی شک نہیں کہ انسان کے دل میں عرفانِ الٰہی کی بڑی زبردست خواہش ہے اور یہہ خواہش ابتدا ہی سے اُس میں موجود ہے۔ ٹھیک جس طرح انسان کو اپنی جسمانی زندگی عزیز ہے اُسی طرح وہ اپنی اندرونی یا روحانی زندگی یعنی الٰہی صحبت کا مشتاق ہے۔ اگر ہم کو اپنی جسمانی بیماریوں اور خرابیوں کا صحیح علم ہو اور تمام خرابیوں کے اسباب اور علاج ٹھیک ٹھیک معلوم ہوں تو ہماری جسمانی زندگی ابدی ہو جائیگی۔ اسی طرح سے اگر ہم خدا کو جانیں اور اُس سے ہمارا صحیح رشتہ ہو تو وہ ضرور ہماری اخلاقی اور روحانی بیماریوں کو دور کردیگا اور ہماری زندگی نہایت اعلےٰ معنوں میں

ابدی زندگی ہوگی +

اگرچہ بہتوں کو یہہ عرفان حاصل نہیں ہوتا اور مایوسی کی حالت میں مرجاتے تو بھی اس عرفان کی خواہش موجود ہے اور اپنی ذات سے خارجی اشیا پر غور و فکر کرنے سے پوری نہیں ہوتی۔ اپنی ہستی کے مطالعہ سے بھی یہہ خواہش پوری نہیں ہوتی لہذا خارجی نیچر اور اپنی ہستی کے مطالعہ سے انسان الٰہی عرفان حاصل نہیں کرسکتا۔ اگر کسی طرح سے دُنیا اس کو حاصل کرسکتی ہے اور کوئی فرد بشر اس سے شرف یاب ہوسکتا ہے تو اسکا یہہ ایک ہی طریقہ ہے کہ خدا خود اپنے آپ کو انسان پر ظاہر فرماوے۔ انسان سے ہرگز ہرگز یہہ نہیں ہوسکتا کہ اپنے علوم کے ردوں سے ایک ایسی عمارت تعمیر کرے جسکی چوٹی عرش الٰہی سے جا لگاوے۔ صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہہ ہے کہ خدا خود انسان کے پاس آوے۔ کیا اُس نے کبھی ایسا کیا ہے؟ کیا ممکن ہے کہ وہ کبھی ایسا کرے؟ یہہ ایک قانون ہے کہ جب نیچر کی طرف سے کوئی ضرورت درپیش ہوتی ہے تو اُس کو پورا کرنے کیلئے کوئی طریقہ بھی ضرور تجویز کیا جاتا ہے۔ اب ہماری ضرورت عرفانِ الٰہی ہے۔ پس اگر یہہ قانون سچ ہے تو اس ضرورت کو پورا کرنیکا کوئی طریقہ بھی ضرور ہے +

کیا وہ ایسا کرسکتا ہے؟ کیا وہ ایسے حقیر اور اپنے ادنےٰ مخلوق انسان سے صحبت رکھ سکتا ہے؟ گذشتہ صدی میں ہماری ترقی کا ایک نتیجہ یہہ ہوا ہے کہ اس رونٹگن ریز اور وائرلیس ٹیلیگراف کے زمانہ میں لفظ "ناممکن" انسانی لغت سے خارج کردیا گیا ہے۔ اس نئی صدی کے شروع میں لوگ یہہ کہہ رہے ہیں کہ سب

چیزیں ممکن ہیں"۔ ہم میں سے بہتوں کو اندھوں بہروں اور گنگوں سے نہایت سادہ خیالات کے سوا کسی اَور باہمی تفہیم میں کامیابی حاصل کرنا ناممکن معلوم ہوگا لیکن ایسا ہوتا ہی۔ ایک جوان لیڈی جو دو سال کی عمر سے اَیسی ہی اُس کی ایسی تعلیم و تربیت کی گئی ہی کہ وہ علاوہ سمجھ سکنے کے شیکسپیر کے ڈراموں پر مضامین لکھتی ہی۔ اگر انسان اندھوں۔ بہروں اور گنگوں کے ساتھ ایسی تفہیم میں کامیاب ہوتا ہی تو اگرچہ انسانی عقل خدا کے سامنے ناچیز ہی تو بھی ہم ہرگز ہرگز یہہ نہیں کہہ سکتے کہ خدا اپنے تئیں انسان پر ظاہر نہیں کر سکتا اور خدا کے خیالات اِنسان کی سمجھ میں نہیں آسکتے +

کیا یہہ اغلب ہی کہ وہ ایسا کریگا؟ انسانی طبیعت کے قوانین اِسکا کیا جواب دیتے ہیں؟ انسان ہمیشہ اپنے مکسوب علم کو اَوروں تک پہنچانے کی فکر میں رہتا ہی اور جو اُس کے خیالات کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں اُن کی صحبت کا مشتاق رہتا ہی۔ چنانچہ آجکل سائنیس دان اصحاب اِس فکر میں ہیں کہ اگر مریخ سیارہ میں کوئی ذی عقل باشندگان ہیں تو اُن سے کسی طرح رابطہ قائم کیا جاوے۔ علاوہ بریں ہم یہہ نہیں مان سکتے کہ اگر کسی نیک آدمی کے آس پاس کے رہنے والے سخت محتاجی اور دکھ بیماری میں مبتلا ہوں اور وہ اُن کی چارہ جوئی جانتا ہو لیکن اُن پر ظاہر نہ کرے۔ کیا ہم یہہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر اِنسان کی حالت اصلاح طلب ہی اور خالق کے عرفان سے اُس میں اصلاح ہو سکتی ہی تو خالق نے ضرور اِنسان کی بہبودی اور اصلاح کی غرض سے اُسے اپنا عرفان بخشنے کی کوئی تدبیر کی ہوگی؟

کیا ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ خدا کی لامحدود دانائی کونسا طریقہ اختیار کریگی؟ ایسا مکاشفہ کونسی روش اختیار کریگا؟ غالباً وہی راہ جو سب سے اچھے انسانی معلّموں نے اختیار کی +

۱۔ شاید پہلی بات اِس امر کی تشریح ہوگی کہ خدا کیا ہی اور انسان سے وہ کیا طلب کرتا ہی۔ اِس تشریح کا بہت سا حصہ ابتدائی ہوگا اور اُس کا بیان سادہ اسباق الاشیا سے ہو سکیگا +

۲۔ پھر کچھ وقفہ ہو سکتا ہی جس میں طالب العلم یہہ تجربہ حاصل کریگا کہ خارجی مدد کے بغیر وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں میں قاصر ہی۔ یہہ نہایت ضروری امر ہی اور اس میں اکثر اِنسانی معلّم ناکامیاب رہتے ہیں۔ وہ تعلیم دیتے وقت کسی بات کی تشریح کر دیتے ہیں اور طالب العلم کو خود سوچنے اور عمل کے وسائل بہم پہنچانے کا موقع مطلق نہیں دیتے بلکہ خود ہی طریق عمل بھی بتا دیتے ہیں۔ اِسکا نتیجہ۔ جیسا کہ ہندوستانی تعلیم میں نظر آتا ہی۔ بہت ہی ناقابل اطمینان ہی۔ طالب العلم کو خود سوچکر اپنے لئے کوئی فیصلہ کرنیکا موقع نہیں ملتا لہذا وہ ایسا کرنا کبھی نہیں سیکھتا۔ مناسب وقت سے پیشتر مدد دینے سے ہندوستان میں بجائے فی الواقع تعلیم یافتہ آدمی پیدا ہونیکے ذہنی نادار پیدا ہو رہے ہیں جن کے علم کا تمام دار و مدار اُن کے اُستادوں پر ہی۔ رٹ رٹا کر امتحانات میں تو کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن کبھی کسی بات کو اپنی ذہنی قوت سے فیصل نہیں کر سکتے +

۳۔ مناسب وقت پر جب بنی آدم اپنی کمزوری کو پہچان لینگے یا جب اُن میں

سے بعض مدد پانے کے لئے تیار ہونگے تو شاید کوئی آدمی اپنے ہم جنس بنی آدم میں بھیجا جاویگا جو حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی پوری پوری بجا آوری سے انسان کے حق میں خدا کی مرضی کو پورا کر دیگا۔ اُس آدمی میں خدا کے خیالات اور ارادے مجتمع ہونگے وہ انسانی صورت میں "خیالِ خدا" اور "کلامِ خدا" ہوگا +

ہم بنی آدم کے درمیان اُس کے ظہور کا نتیجہ یہہ ہوگا کہ اُس کے واپس جانے پر وہ قوت (روح) جو اُس پر تھی اوروں تک پہنچیگی جب اُنکو ہر ایک عملی معاملہ میں اپنے لئے خود فیصلہ کرنے کی ضرورت ہوگی اور وہ ہر بات میں اُسی کے محتاج نہیں ہونگے +

ہم اِس قابل تو نہیں ہیں کہ محدود انسان کا لامحدود خدا سے رشتہ قیاس کر سکیں لیکن ہماری ناقابلیت اور سمجھ کی کمی اِس رشتہ کے خیال کو رد کرنے کے لئے کوئی معقول عذر نہیں ہے۔ اگرچہ ہم یہہ نہیں سمجھ سکتے کہ ذہنی طاقتیں اور قوتیں مادی اشیا میں کس طرح سکونت پذیر ہو سکتی ہیں تو بھی ہم جانتے ہیں کہ یہہ ایک حقیقت ہے کیونکہ ہمارے اجسام خاکی ہیں اور اِن اجسام میں وہ قوتیں سکونت پذیر ہیں جو مادی اور خاکی نہیں ہیں +

اگرچہ اِس قسم کا اظہار بعض کے نزدیک ناممکن ہے تو بھی اِسکے خیال کو نامعقول قرار دیکر ترک نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ابتدا ہی سے بنی آدم ایسے اظہار یا اوتار کے متواتر معتقد ہوتے چلے آئے ہیں۔ موجودہ کتابوں میں سے ایک سب سے پُرانی کتاب میں ایک آدمی اپنے عقیدہ کو یوں بیان کرتا ہوا پیش کیا گیا: "میں جانتا ہوں کہ میرا نجات دہندہ زندہ ہے اور وہ قیامت کے

روز موجود ہوگا .... میں خدا کو اپنے لئے دیکھونگا"۔ اِن الفاظ سے ایک ایسا عقیدہ ظاہر ہوتا ہے جو روئے زمین کی متفرق اور مختلف اقوام میں پایا جاتا تھا اور اِس کی وجہ اور بنیاد صرف یہی بات ہو سکتی ہے کہ قدیم زمانہ میں کم از کم بنی آدم کو یہہ سوال پیش آیا کہ "انسان خدا کو کس طرح جان سکتا ہے"؟ اور اِس مشکل سوال کا جواب اُن کی عقل نے ایسے اظہار یا اوتار کے امکان میں پایا +

ہمیشہ سے اِس اظہار کا ایک مضمون یہہ بھی چلا آیا ہے کہ خدا ضرور اپنے تئیں انسانی صورت میں ظاہر کریگا۔ قرآن جو کہ اِس خیال کی تردید کرتا ہے اُس میں دو مقاموں پر یوں مندرج ہے (۱) وقالوا لولا انزل علیہ ملک ... ولو جعلنٰہ ملکا لجعلنٰہ رجلاً (۲) لو کان فی الارض ملٰئکۃ یمشون مطمئنین لنزلنا علیھم من السماء ملکا رسولاً" یعنے اور کہتے ہیں کیوں نہ اترا اُس پر کوئی فرشتہ .... اور اگر ہم رسول کرتے کوئی فرشتہ تو وہ بھی صورت میں ایک مرد کرتے۔ اگر زمین میں فرشتے بستے اور پھرتے ہوتے تو ہم اُن پر آسمان سے کوئی فرشتہ رسول بھیجتے (سورۂ انعام آیت ۸ و ۹ اور سورۂ بنی اسرائیل آیت ۹۷) +

اگر فرشتوں کی طرف جانے والے رسول کے لئے فرشتوں کی صورت اور انسان کی طرف جانے والے کے لئے انسانی صورت اختیار کرنا ضروری ہے تو اوصاف ظاہر ہے کہ ہم کو تعلیم دینے کے لئے خدا خود بھی آوے کیونکہ اُس کے

سوا کوئی اَور اُس کی باتیں ہم کو نہیں سکھا سکتا، تو وہ بھی ضرور انسانی صورت میں آویگا +

اِس کا سچّا مکاشفہ کس طرح معلوم ہو

بہت سے لوگوں کے خیال کے مطابق ایسا نجات دہندہ آچکا ہے۔ علاوہ بریں بہت سی اقوام کے پاس ایسی کتابیں ہیں جو تحریر شدہ مکاشفہ خیال کیجاتی ہیں جن کے پہلے یا بعد مجسّم مکاشفہ ضروری مانا گیا ہے۔ اب ہم کو اپنے لئے اِس امر کا فیصلہ کرنا ہے کہ اَیسے دعوے کی کوئی بنیاد ہے یا نہیں اور اُن کتابوں میں سے کونسی مستند تسلیم کی جا سکتی ہے۔ اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ ہمارا محک امتحان کیا ہوگا۔ مادی مخلوق کی الٰہی کتاب اور فطرتِ انسانی میں بہت سے اُصول و قوانین پائے جاتے ہیں جو لا کلام خالق کی دانائی اور مرضی کے مطابق ہیں۔ جو کتاب اُس کی طرف سے الہامی ہونیکا دعوے کرے ضرور ہے کہ اس قسم کی ہو۔ جو خیالات خدا کی مذکورہ بالا لاکلام ولاریب کتاب میں پائے جاتے ہیں وہ اُس ہر ایک کتاب میں ہونے چاہیئے جو اُس کی طرف سے ہونے کی مدعی ہے۔ اس امر کی زیادہ تشریح یوں ہو سکتی ہے کہ ہم نیچر کی لاریب کتاب سے بعض اصول و قوانین لیکر اُن کی مدد سے مدعیان کے دعاوی کو پرکھیں +

(۱) مذکورہ بالا لاریب کتاب میں اعلےٰ درجہ کی دانائی کے نشانات و علامات نظر آتے ہیں۔ فطرت کا ہر ایک جزو اور ذرّہ اپنے خاص کام اور مطلب کو پورا کر رہا ہے لیکن پھر بھی یہہ دانائی مخلوقات و موجودات کی سطح پر دھری ہوئی نہیں ہے۔ ننانوے فیصدی لوگ ایسے طور سے زندگی بسر کرتے ہیں کہ اپنے چاروں

طرف کی اشیا کی مخفی دانائی اور حکمت کو مطلق نہیں جانتے۔ الہام شدہ دین کی ہر صورت میں ایک ہی طرح کی دانائی نظر آنی چاہئے اور ایسے وسائل ہونے چاہیئے جن سے ایک ہی انجام حاصل ہو لیکن تاہم یہہ دانائی از خود ظاہر نہیں ہوتی۔ صرف وہی لوگ اِس دانائی سے آگاہ ہو سکتے ہیں جو اِس کو ڈھونڈتے اور اِس پر غور کرتے ہیں +

۲۔ ہم قانون کو موجود پاتے ہیں۔ اجرام فلکی اپنے اپنے مدار پر ایسی باقاعدہ اور باترتیب گردش کرتے رہتے ہیں کہ آدمی ایک سیارہ کی گردش کے مطالعہ سے ٹھیک ٹھیک بتا سکتا ہے کہ کسوف شمسی کب واقع ہوگا اور نہ صرف فطرت میں قانون ہی پایا جاتا ہے بلکہ اِس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے سزا بھی موجود ہے یہہ مضمون نہایت ضروری ہے اور ہم اِس پر پروفیسر ہکسلی صاحب کی گواہی پیش کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک کی خوشی اور جو لوگ ہم سے کچھ علاقہ رکھتے ہیں کم و بیش اُن کی خوشی کا دارومدار اُس کھیل کے قواعد و قوانین کو جاننے پر ہے جو شطرنج سے بھی بہت زیادہ پیچیدہ اور مشکل ہے۔ نامعلوم زمانوں سے ہر ایک زن و مرد اس کھیل کو کھیلتا آیا ہے۔ اس کھیل کی بساط دنیا ہے اور اِس کے مُہرے مظاہر و شواہد عالم۔ اِس کھیل کے قواعد و قوانین وہی ہیں جن کو ہم قوانین فطرت یا قوانین نیچر کہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ دوسری طرف سے کھیلنے والا ہماری نظر سے غائب ہے ہم جانتے ہیں کہ وہ کھیلنے والا منصف اور صابر ہے لیکن ساتھ ہی ہم کو یہہ بھی معلوم ہے کہ وہ کسی غلطی سے درگذر نہیں کرتا اور ہماری لاعلمی کے سبب سے کسی طرح کی

رعایت نہیں کرتا۔ جو آدمی اچھی طرح کھیلتا ہی اُس کو نہایت فراخ دلی اور فیاضی سے بڑی بڑی رقوم ادا کیجاتی ہیں۔ لیکن جو اچھی طرح نہیں کھیلتا اُسے بغیر کسی طرح کے افسوس کے مات دیجاتی ہی" +

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ "قانون راست اور اچھا ہی لیکن ہر ایک خلاف ورزی کی واجبی سزا ملتی ہی"۔ ہر ایک الہام شدہ دین میں یہی اُصول ہونے چاہئے ورنہ یہہ دُنیا کے مقنّن کی طرف سے نہیں ہی +

۳۔ نیچر کی کتاب میں ایک اور عجیب قانون نظر آتا ہی کہ ہر ایک جاندار کو اپنی بقائے حیات کے لئے اور چیزون کو ہلاک کرنا پڑتا ہی۔ کوئی جاندار کسی دوسرے جاندار نباتی یا حیوانی کی جان لئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مختصراً یوں کہیں کہ اوروں کی موت سے ہم زندگی پاتے ہیں اور اپنے روزانہ بدنی نقصانات کو پورا کرتے ہیں۔ یہہ قانون نہایت ہی عجیب ہی تاہم نہ اسے سمجھ سکتے ہیں اور نہ سمجھا سکتے ہیں۔ پس اگر الٰہی الہام کی مدعی کتابوں میں سے کسی میں یہہ لکھا ہو کہ ہماری روحانی زندگی کا دار و مدار کسی دوسرے کی موت پر ہی تو اس بعید الفہم اور عجیب قانون کے سبب سے ہم اُس کتاب کو رد نہیں کر سکتے بلکہ ہم ایسی کتاب کا الہام الٰہی ہونا قرین قیاس سمجھینگے۔ کیونکہ یہہ عجیب قانون قوانین نیچر سے مطابقت رکھتا ہی +

۴۔ ہم جانتے ہیں کہ تمام عالم کے سائنس دان مانتے ہیں کہ انسان بتدریج ترقی کرکے موجودہ حالت پر پہنچا ہی۔ اگر یہہ عقیدہ صحیح ہی تو اس امر کی کوئی دلیل نہیں کہ انسان کی ترقی تکمیل کو پہنچ گئی ہی اور زیادہ ترقی کی گنجایش نہیں۔ اِن نیچری قوانین

کے مقنّن کی طرف سے جو کتاب ہوگی وہ اِنسان کے سامنے ترقی کے اُس اِمکان اور وسیع میدان کو پیش کریگی جس تک حضرت اِنسان کی ہنوز رسائی نہیں ہوئی۔ جس ترقی کے دوران میں انسان کی موجودہ فطرت کے بعض اجزا غائب ہوجائینگے اور اُن کے عوض میں اُن اجزا کا ظہور ہوگا جنکا تخم اُس کی ذات میں ہی اور بتدریج ترقی کریگا +

۵۔ پھر ہم دنیا میں ایک اور قانون دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی مقصد کو حاصل کرنا چاہے تو اُسکے حصول کے لئے اُسے سخت جد و جہد اور کوشش کرنا ہوتا ہی۔ مثلاً انسان کی روزانہ خوراک کا معاملہ ایسا ہی ہی۔ ممکن ہی کہ زمین کے بعض حصوں میں انسان کی گذران کے لئے اُس کی سخت محنت کے بغیر ہی کافی پیداوار حاصل ہو لیکن ایسے حصوں کے رہنے والوں کا چال چلن ابتر ہوجائیگا۔ گیہوں (جو کہ غالباً زمین کی سب سے قیمتی پیداوار ہی) انسان کی سخت محنت و مشقت اور محافظت سے پیدا ہوتی ہی۔ جبکہ اِس فطرتی اور طبعی زندگی کا یہہ حال ہی تو روحانی زندگی کے باب میں بھی، ہم سوچ سکتے ہیں کہ انسان کو کس قدر محنت و مشقت کرنا ہی تاکہ ترقی کے مدارج میں بڑھتے بڑھتے آخر کار درجہ تکمیل تک پہنچ جاوے۔ اگر کوئی کتاب یہہ کہے کہ انسان بلا مشقت ہی اعلٰے زندگی حاصل کر سکتا ہی تو اُس کی صداقت میں ہمیں بہت شک ہوگا کیونکہ ہم جانتے ہیں بلا مشقت کسی مقصد کا حصول حاصل کرنے والوں کی اعلٰی ترقی کے بجائے اُن کی ابتری کا باعث ہوگا +

۶- لیکن ہم یہہ امید نہیں رکھہ سکتے کہ انسان اپنی ہی سعی و کوشش سے ترقی کے اس کمال پر پہنچ جائیگا۔ زمین کی سالانہ پیداوار کے متعلق ہم یہہ اصول دیکھتے ہیں کہ اچھی فصل حاصل کرنے کے لئے کسان کو سوچ بچار کرنا۔ تدابیر و تجاویز کرنا اور اس سے بڑھکر سخت محنت و مشقت کرنا ہوتا ہی مگر پھر بھی فصل کا دار و مدار انہی باتوں پر نہیں ہی بلکہ وہ سورج کی گرمی اور روشنی وغیرہ ایسی بیرونی اور خارجی طاقتوں کا محتاج ہی جن پر اُس کا کچھہ بھی اختیار نہیں ہی۔ کسان کی محنت و تجاویز اور خارجی طاقتیں ملکر کھیتوں میں فصل پیدا کرتی ہیں۔ لہذا ہم صاف اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اگر الٰہی الہام و مکاشفہ کا وجود ہی تو اُس کا حصول بھی باوجود انسان کی سعی و جستجو کے خارجی قوت پر موقوف ہی +

۷- میں اس وقت ایک پھلدار درخت کے سامنے بیٹھا لکھہ رہا ہوں۔ یہہ درخت شگوفوں سے لدا ہوا ہی۔ اس پر سینکڑوں کامل شگوفے ہیں۔ ہر ایک شگوفہ میں یہہ امکان ہی کہ پھل کی صورت اختیار کرکے پک جاوے اور بیج پیدا کرے اور اگر اُس بیج کو موافق حالات پیش آویں تو وہ بھی ایک پھلدار درخت بنے۔ لیکن سب شگوفوں کا یہہ انجام نہیں ہوگا۔ ایک ماہ بعد ان سینکڑوں شگوفوں کی جگہ چند دہائی کچے پھل اس درخت پر نظر آئینگے اور ان میں سے بھی صرف ایک قلیل تعداد کمال تک پہنچیگی اور شاید صرف ایک یا دو سے آخری مقصد یعنے نئے درخت حاصل ہونگے۔ تاہم ہر ایک شگوفہ میں یہی امکان ہی بشرطیکہ موافق حالات پیش آویں اور اُن سے فائدہ اُٹھاوے اور مخالف حالات یعنے باد و باران

وغیرہ سے برباد نہو جائے۔ لہذا مکاشفہ و الہام کی ہر ایک صورت سے میرا مطالبہ ایسی ہی تعلیم کا ہی کہ ہر چند ہر ایک فرد بشر میں اعلےٰ درجہ اور اپنی علت غائی پر پہنچنے کا امکان ہی تو بھی معدودے چند ہی ایسے ہیں جن میں یہہ مقصد پورا ہوگا۔ لیکن جو اس درجہ تک نہیں پہنچتے وہ نیست و نابود نہیں ہو جاتے۔ جو شگوفے کمال کو نہیں پہنچتے وہ نابود نہیں ہوتے بلکہ وہ نیچر کے دیگر مقاصد کے حصول میں کارآمد ہوتے ہیں۔ اسی طرح جو انسان ترقی کے کمال تک نہیں پہنچتے اُن سے اور اور مقاصد پورے ہوتے ہیں +

۸- جیسا کہ ڈارون صاحب نے لکھا ہی انسانی ترقی کے باقیماندہ حصہ کی بھی چند خاص قوانین کی مدد سے تکمیل ہونی چاہیئے۔ وہ قوانین کونسے ہیں؟ ایک دفعہ مصنف کے ایک دوست نے (جو اپنے تئیں اگناسٹک کہتا تھا) اُس سے یوں کہا "اگرچہ میں خدا کی ہستی کے اقرار کے لئے کافی دلایل نہیں دیکھتا تو بھی میں یہہ دیکھتا ہوں کہ انسان یہہ چند خاص سبق سیکھنے کے لئے اس دنیا میں رکھا گیا ہی اور اُن میں سے سب سے بڑا سبق یہہ ہی کہ انسان کو بہت سی ایسی باتوں سے محروم رہنا ہی جنکو وہ حاصل کرنا اور عمل میں لانا چاہتا ہے۔ کسی آدمی کو کبھی وہ تمام چیزیں نصیب نہیں ہوئیں جن کی اُس نے خواہش کی اور کبھی اُن تمام کاموں کو کرنے کی فرصت و توفیق نہیں ملی جنکو اُس نے کرنا چاہا۔ اگر آدمی اپنے لئے زوجہ منتخب کرکے نکاح کرے اور اولاد پیدا کرے تو اُس کی زندگی اور بھی پیچیدہ ہو جاتی ہی۔ وہ اپنی خوشی سے بہت سی چیزوں سے محروم رہتا ہی تاکہ

وہ چیزیں اُس کی بیوی اور اولاد کو ملیں"۔ پس اگر کتاب نیچر میں انسان کے لئے یہہ سب سے بڑا سبق ہی تو ہم کسی ایسے اُستاد یا پیشوا کی تعلیم کو قبول نہیں کر سکتے جو اپنے پیروی کنندگان کے سامنے خود انکاری اور ایثار کے سبق کو اول درجہ پر نہ رکھے اور ایسے اُصول و اعمال کو اپنی شخصی زندگی میں نہ دکھلاوے۔ ہمارا اُستاد اور پیشوا وہ ہونا چاہئے جس نے اوروں کے فائدہ کے لئے اپنے تئیں خالی کر دیا ہو +

۹۔ ایک باریک بین محقق نے اِس رسالہ کا مسودہ دیکھکر ایک اور قانون کی طرف توجہ کھینچی۔ یعنے دکھ درد کے عجیب اور عالمگیر قانون کی طرف۔ نہ صرف وہ دکھ جس کے لوگ انصاف کے تقاضا سے مستوجب ہوتے ہیں بلکہ ایسے دکھ اور تکالیف جو لوگوں پر ناحق آپڑتے ہیں اور وہ اسکا سبب پوچھتا ہی۔ ایسے اسباب کا بیان ہماری طاقت اور سمجھ سے باہر ہی۔ اِس سے ہمارے مذکورہ بالا بڑے سبق کی تشریح ہو سکتی ہی جب ہم پر ہماری مرضی کے خلاف اور مجبوری کی کوئی مصیبت آپڑتی ہی تو ہم اُس کے سبب سے اپنی زندگی کی خوشیوں کا پورا حظ نہیں اُٹھا سکتے اور اِس سے بھی بہتر یہہ ہی کہ ہم اپنے ارادہ اور اپنی خوشی سے بہت سے آرام و آسائش سے محروم رہتے ہیں تاکہ اوروں کو اُن کے دُکھ اور تکلیف سے بچاویں۔ اگر دنیا میں دُکھ اور مصیبت نہ ہوتے تو یہہ اور بھی خود غرضی کا گھر ہوتی اور اگر اس میں مفلس لوگ نہوتے تو یہہ مفلس تر ہوتی + لیکن جب کہ ہم قانون کو ٹھیک طور سے سمجھ اور سمجھا نہیں سکتے اتنا ضرور صاف

دیکھتے ہیں کہ اگر یہہ قانون عالمگیر ہی اور ہم کو اِس سے سبق سیکھنا ہی تو کوئی اُستاد ہم کو سکھلانے کے لئے مقرر شدہ نہیں ہو سکتا جس نے خود یہہ سبق نہیں سیکھا اور جو اپنے دُکھوں اور اپنی مصیبتوں کے ذریعہ سے کامل نہیں کیا گیا اور جس نے اپنی خوشی سے اپنے آپ پر دُکھوں کا بوجھ برداشت نہیں کیا۔ ہم ایسے اُستاد و پیشوا کے قدم پکڑینگے لیکن کسی دوسرے کو اپنی آئندہ ترقی و تکمیل کی راہ میں اپنا ہادی اور پیشوا نہیں بنائینگے +

۱۰۔ ہماری طبعی زندگی میں کسی طرح کا جبر نہیں پایا جاتا۔ اگر کوئی سیکھنا نہ چاہے تو اُسکو سیکھنے پر مجبور کرنے کے لئے کوئی طاقت استعمال میں نہیں لائی جاتی۔ انسان کو پورا اختیار حاصل ہی کہ اگر چاہے تو اپنے جسم کی پرورش کے لئے کھانا نہ کھاوے۔ وہ اختیار رکھتا ہی کہ اگر چاہے تو اپنی اس زندگی سے عاری ہو جاوے۔ اُسے مجبوراً زندہ رکھنے کے لئے کوئی طاقت کام میں نہیں لائی جائیگی۔ لہذا سچے اِلہام اور مکاشفہ میں بھی کسی طرح کا جبر نہیں ہوگا۔ لوگوں کو ماننے پر مجبور نہیں کیا جائیگا۔ وہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائیگا لیکن اُن کو اُس کے رد و قبول کے باب میں پوری آزادی ہوگی +

۱۱۔ اب صرف ایک اور محکِ امتحان باقی ہی۔ ہم دنیا میں ایک **قوت** دیکھتے ہیں۔ یہہ وہ **لامحدود قوت** ہی جو دانائی کے مطابق ہمیشہ اشیائے عالم کو خاص مقاصد کے موافق مختلف صورتوں پر قائم کرنے میں مشغول ہی۔ اسی طرح سچے دین میں بھی ایک ایسی **قوت** کا ہونا ضروری ہی جو بنی آدم کو دنبدن

کابل کرتی جاوے۔ ہم کسی دین کو سچا نہیں مانینگے جب تک یہہ بات نہ دیکھیں کہ جو اُس کی پیروی کرتے ہیں وہ اُن کو فائدہ پہنچاتا ہی۔ پیروی کرنیوالوں سے وہ لوگ مراد نہیں ہیں جو صرف برائے نام کسی دین کو مانتے ہیں اور صرف چند ظاہری رسوم کی بجاآوری پر ہی کفایت کرتے ہیں بلکہ ہماری مراد اُن لوگوں سے ہی جو دل و جان سے دین کو قبول کر کے اُس کی تعلیمات کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں اپنا دستور العمل بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو دین سب سے اچھے نتائج پیدا کرتا ہی اور نیکی کرانے میں سب سے بڑی طاقت ہی صرف وہی سچا دین ہی۔ اگر ہم کوئی ایسا دین دیکھیں کہ اُس کے ماننے والوں میں باہمی عدل و انصاف۔ رفاہِ عام مستورات کی عزت اور بیماروں اور مصیبت زدوں کی مدد و خبرگیری پائی جائے۔ جو تمام بنی آدم کی ترقی اور بہبودی کو مدنظر رکھے اور اپنے تئیں اُن کی اخلاقی اور عقلی ترقی کے قابل ثابت کرے تو ایسے دین کو الہامی سچائی تسلیم کرنے کے لئے ہمارے پاس کافی دلائل ہونگے۔ اور اگر اُس میں بہت سی ایسی باتیں ہوں جو ہماری موجودہ قوتِ فہم سے بالا و برتر ہیں تو اِس سے اور بھی اُس کی تائید ہوگی ✣

کہتے ہیں کہ ایک مشہور مدبرِ امورِ سلطنت کے سامنے مختلف ادیان کا باہم مقابلہ کیا جا رہا تھا۔ اِسی بحث میں کسی نے کہا کہ تمام ادیانِ مختلفہ برابر ہیں اور ایسی تمام کتابیں بھی جو الہٰی الہام کی مدعی ہیں برابر ہیں۔ انسان کے لئے سب سے ضروری بات یہہ ہی کہ وہ اپنی ضمیر کی پیروی اور اطاعت کرے۔ اُس مدبر نے اِس کے جواب میں یوں کہا آپ کا فرمانا یہہ ہی کہ دیگر ادیان اپنی خوبی میں میرے دین کے برابر ہیں

اور دیگر دینی کتابیں اپنی قدر و قیمت میں اُس کتاب کی مانند ہیں جس کی میں پیروی کرتا ہوں۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ میرے دین کی کتاب جہاں جاتی ہی انصاف اُس کے ساتھ جاتا ہی۔ دیگر ادیان کے حامی مجھ کو تمام روئے زمین سے پچاس مربع میل کا ایسا قطعہ دکھاویں جہاں میرے دین کی کتاب نہیں گئی بلکہ وہاں کے لوگ کسی اَور کتاب کی پیروی کرتے ہیں اور اگر اُس علاقہ میں انصاف۔ بیماروں اور مصیبت زدوں کی خبرگیری اور مستورات کی عزت بمقابلہ اُن ممالک کے جہاں میرے دین کی کتاب کی پیروی ہوتی ہی زیادہ ہو تو مَیں صاف مان لونگا کہ وہ کتاب میرے دین کی کتاب سے بہتر ہی۔ محکِ امتحان ایسا ہی ہونا چاہئے ✣

جو فلسفہ تمام موجودات کی تشریح و تفہیم کا دعویٰ کرے اُسکے لئے ہمارا محکِ امتحان بھی ایسا ہی ہوگا۔ ہم اُسکو تسلیم نہیں کرینگے جو صرف تعلیم یافتہ لوگوں کو پسند آوے بلکہ اُسے جو اپنے پیروی کنندگان کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچانے والا ہو۔ دین کی سچائی اور صداقت کا سب سے بڑا ثبوت یہہ ہی کہ وہ اپنے پیروی کنندگان کی سب سے بڑی تعداد میں اعلےٰ درجہ کی نیکی پیدا کرنے کی قابلیت رکھتا ہو ✣

P. S. - اگر کوئی اِس مضمون پر مزید تحقیقات کرنا چاہے تو ایک چھوٹی سی کتاب الموسومہ بہ "دی فلاسفی اُو دی پلین اُو سلویشن" (یعنے تدبیرِ نجات کی فلاسفی) کا جو ریلیجس ٹریکٹ سوسائٹی کی طرف سے شایع ہوئی ہی ضرور مطالعہ کرے ✣

تمت بالخیر

مشن سٹیم پریس۔ لودھیانہ